نئے میدان عمل میں پہلے کام

(۱)
تعمیر مساجد و اقامت صلوٰۃ

(۱) لَّمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَـوْمٍ اَحَـقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَـالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۱۰۸؁ (سورہ توبہ ۔ ۱۰۸)

”البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن[1] سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس کی پوری حقدار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے

---

[1] اول یوم کے معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اول یوم وجودہ یا اول یوم بناء یعنی وجود میں آنے کے پہلے دن سے یا تعمیر کے پہلے دن سے لیکن یہاں یہ نکتہ بھی نظرانداز نہ ہونا چاہئے کہ یوم کے معنی دور کے بھی آتے ہیں ۔ کمافی قولہ تعالیٰ خلق الارض فی یومین (المفردات فی غریب القرآن) یعنی ہجرت کے بعد جو دور شروع ہوا اس کے آغاز میں، اور یہی سبب ہے کہ اس اول یوم کو تاریخ یعنی سنہ ہجری کا پہلا دن مانا گیا ۔ افا دالسھیلی ان الصحابة رضی اللہ عنہم اخذوالتاریخ من قولہ تعالیٰ لَمسجد اسس علی التقوی من اول یوم (وفاءالوفاءص ۱۷۷ ج ۱) یعنی صحابہ کرام نے لَّمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَـوْمٍ سے ہی استدلال کرتے ہوئے سنہ ہجری کا آغاز اس دن سے کیا ہے ۔

پیچھے نماز پڑھیں) اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ (بھی) پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

(۲)اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللہَ فَعَسٰی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ ﴿۱۸﴾ (سورہ توبہ ، ۱۸)

”فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو صرف وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانے جو لوگ ایسے ہیں انہیں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہدایت یاب (سعادت اور کامیابی کی راہ پانے والے) ہونگے ۔“

(۳) وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (سورہ بقرہ ۴۳)

”نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور سرنیاز خم کرو ان کے ساتھ جو اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا رہے ہیں ۔“

مسجد قبا :

قبا کا قیام عارضی تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ کا کوئی لمحہ اس فرض کی انجام دہی میں صرف نہ ہوتا جس کے لئے وہ خدا کے رسول اور پیغامبر بنائے گئے تھے ۔

اقامۂ دین⁰ جو انبیاءعلیمسلم کا نصب العین ہوتا ہے اس کا پہلا کام ہے اقامت الصلوٰۃ یعنی ایسا ماحول بنانا اور ایسی جماعت تیار کرنا جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز اور جس کے دل کا چین ذکر اللہ ہو ۔

قبا پہنچ کر سب سے پہلے آپ نے اس فرض کو انجام دیا، اس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے جو نمبراول میں تحریر کی گئی ہے ۔

جماعت :

خدا پرستی یعنی خدا واحدکی عبادت آپﷺکی فطرت تھی ۔ شب معراج میں خاص نوعیت کی تعلیم دی گئی اور اگلے روز حضرت جبرئیل علیسلم نے نازل ہوکر پانچوں وقت کی نمازوں کی عملی تعلیم بھی دیدی ۔ دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھاکر جس طرح حضرت جبرئیل علیسلم نے ارکان اور اوقات نماز کی تعلیم دی: جماعت اور نماز باجماعت کا طریقہ بھی بتادیا، لیکن جب تک آنحضرت ﷺ مکہ معظمہ میں رہے تسلسل کے ساتھ نماز باجماعت کا موقع نہیں مل سکا، جہاں اسلام کا نام لینا ہی مشکل تھا وہاں جماعت کا سلسلہ کس طرح قائم ہوسکتا تھا ۔ مدینہ کے حضرات اسلام سے مشرف ہوئے ۔ ان کی تعلیم کے لئے خاص خاص

⁰ یعنی دین کے منشاءاور مقصد کو صحیح طور سے سمجھنا اس کے تمام پہلوؤں کا خیال رکھنا اور پوری مستعدی سے اس کو جامہ عمل پہنانا ۔

حضرات کو بھیجا گیا۔ یہاں کچھ حلقہ مسلمانوں کے قائم ہوئے تو نمازوں کی جماعتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔

پھر ان حضرات نے اپنے ہی اجتہاد سے ہفتہ میں ایک روز عمومی جماعت کے لئے بھی مقرر کرلیا اور سرورکائنات رسول اللہ ابھی مکہ معظمہ میں تھے کہ نماز جمع کی فرضیت بھی نازل ہوگئی۔ جس نے حضرات صحابہ ضاللہعنہ کے اجتہاد کی تصدیق کردی ۔ صحابہ کرام کا یہ اجتہاد وہ تھا جس پر آنحضرتﷺفخر کیا کرتے تھے کہ یہود اور نصاریٰ نے ہفتہ میں ایک دن عمومی اجتماع کے لئے مقرر کیا مگر وہ منشاءخداوندی کے مطابق نہیں تھا ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس دن کی توفیق بخشی جو منشاءخداوندی کے عین مطابق تھا ۔لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی ۔ اور تاریخ اسلام اب تک بجز ایک مسجد کے جو حضرت صدیق اکبر ضاللہعنہ نے مکہ معظمہ میں اپنے مکان کے سامنے میدان میں بنالی تھی[2]، کسی اور مسجد کی تعمیر سے نا آشنا تھی، کوئی مکان کوئی میدان یا کسی میدان کا کوئی حصہ نماز کے لئے مقرر کرلیا جاتا تھا۔ وہاں لوگ نماز پڑھ لیا کرتے تھے ۔ عموماً بکریوں کے باڑے[1] میں کسی حصہ کو نماز کے لئے مخصوص کرلیا کرتے تھے ۔ ورنہ جہاں وقت آتا نماز پڑھ لیا کرتے

---

[2] بخاری شریف ص ۵۵۳

[1] یہ باڑے رہائشی مکانوں کے قریب ہوتے تھے اور عام لوگ انہیں باڑوں میں رہا بھی کرتے تھے ۔

تھے ۔

قبا کا قیام عارضی تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ کتنے روز قیام رہا ۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف تین روز قیام رہا، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس عارضی قیام میں آنحضرتﷺنے مسجد کی بنیاد ڈال دی[2]۔ کلثوم بن ہدم جو آنحضرتﷺکے میزبان تھے انہیں کا ایک میدان تھا جس میں کھجور سکھائے جاتے تھے۔ اسی میدان میں یہ مسجد تعمیرکی گئی ۔ سب سے پہلے آپ نے پتھر رکھا ۔ دوسرا پتھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور تیسرا فارق اعظم رضی اللہ عنہ سے رکھوایا ۔ پھر جملہ صحابہ نے حصہ لیا ۔ خود ہی مزدور تھے اور خود ہی معمار، مزدوروں میں خود آقا دوجہان بھی شامل رہے ۔ بھاری بھاری پتھر اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہوجاتا ۔ مٹی بدن اطہر پر پڑتی، کوئی صحابی آگے بڑھ کر پتھر لے لیتا تو آپ دوسرا اٹھالیتے تھے ۔[3]

مسجد کی تعمیر کے ساتھ آداب معاشرت اور اخلاق کی تعمیر بھی ہوئی حتیٰ کہ کلام اللہ شریف میں جب مسجد کا تذکرہ فرمایا تو ساتھ ساتھ اہل مسجد کی بھی تحسین فرمائی : فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا (توبہ ۱۰۸) (اس میں وہ

---

[2] واسس المسجدالذی اسس علی التقویٰ بخاری شریف ص ۵۵۵ وفا الوفا ءکی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی ۔ مدینہ میں قیام فرمانے کے بعد آپ صحابہ کرام کے ساتھ قباءتشریف لائے اور مسجد کی تعمیر کرائی ۔ وفاءالوفاءص ۱۷۹ ج ۱ ۔

[3] وفاءالوفاءص ۱۸۰ ج ۱

لوگ ہیں جو محبت کرتے ہیں اس بات سے کہ پاک صاف رہیں) پھر ان کو شرف لازوال اور فخر دائم یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا پروانہ بھی عطا ہوگیا وَاللہُ یُحِبُّ الْمُطَّہِرِینَ (توبہ، ۱۰۸) (اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے)

مسجد مدینہ، مسجد النبی علیہالسلتلسلم :

قبا سے مدینہ تشریف آوری ہوئی تو جس جگہ ناقہ بیٹھا تھا، وہی جگہ مسجد کے لئے منتخب کی گئی۔

یہ جگہ ایک میدان کے کنارے پر تھی ۔ قبیلہ بنی نجار کے حضرات یہاں نماز پڑھاکرتے تھے۔[4] زمین کے مالک یہاں کھجوریں بھی سکھایا کرتے تھے ۔ میدان کے باقی حصہ میں کھجور کے درخت کھڑے تھے۔ کچھ پرانی قبریں اور کچھ مکانوں کے کھنڈر تھے ۔ ایک طرف کچھ نشیب تھا وہاں پانی بھرجاتا تھا۔ اس خرابہ کی قسمت جاگی، سید الانبیاءنے اسی کو مسجد کے لئے منتخب فرمایا ۔ یہ طول وعرض میں سو سو گز سے

---

[4] حضرت اسعد بن زرارہ ضہللہعنہ نے یہاں ایک دیوار بیت المقدس کے رخ پر بنادی تھی ۔ یہیں جمعہ کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے ۔ سایہ کی کوئی چیز دیوار پر نہیں تھی ۔ ابن سعد ص ۲ ج ۲ ہماری اصطلاح میں ایسی مسجد کو قناتی مسجد کہتے ہیں۔ عیدگاہیں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں ۔

کچھ زائد تھا۔[1]

سہل اور سہیل کے والد رافع بن ابی عمرو کا انتقال ہوچکا تھا ۔ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ ان کے مربی تھے ۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ میدان ان ہی یتیموں کا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ بلا کسی معاوضہ کے مسجد کے لئے پیش کردیں، مگر آنحضرت ﷺ اس طرح کی پیشکش[2] بڑے آدمیوں سے بھی منظور نہیں فرمایا کرتے تھے ۔ یتیم بچوں سے کیسے منظور فرمالیتے۔ دس دینار قیمت تجویز کی گئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ قیمت ادا کرکے زمین مسجد کے لئے وقف کردی ۔[3] رضی اللہ عنہم

زمین ہموار کی گئی، پانی سینچ دیاگیا، قبروں سے ہڈیاں نکلیں ان کو الگ دبا دیا گیا ۔ درخت کٹوائے گئے، بنیاد کھودی گئی، تعمیر شروع

---

[1] ابن سعد ص ۲ ج ۲ ۔

[2] یعنی آنحضرت ﷺ کوئی ضرورت ظاہر فرماتے اس پر بطور ہدیہ وہ چیز آپ کو پیش کی جاتی تو بطور ہدیہ اس کو منظور نہیں فرماتے تھے بلکہ قیمت ادا فرماتے تھے ۔ جیسے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمتاً منظور فرمایا ۔ البتہ بغیر آنحضرت ﷺ کی طلب کے کوئی ہدیہ پیش کیاجاتا تو اس کو منظور فرمالیتے تھے ۔

[3] ابن سعد ص ۲ ج ۲ غزوہ خیبر کے بعد جب مسجد بڑھائی گئی تو اس کے لئے جو زمین خریدی گئی تھی اس کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ادا فرمائی۔ ترمذی شریف مناقب عثمان ، ص ۲۰۹ ج ۲۔ مگر اب زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی اس ٹکڑے کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار اور ایک روایت ہے کہ پچیس ہزار اد کی ہے ۔ وفاءالوفاءص ۲۴۱ ج ۱۔

ہوئی، یہاں بھی صحابہ کرام ضللہعنہ ہی مزدور تھے، وہ ہی معمار، سید الانبیاءﷺ بھی برابر کے شریک تھے ۔

عجیب و غریب پُرتقدس جذبے سے کام ہورہا تھا۔ پتھر اٹھائے جاتے تو یہ رجز پڑھاجاتا تھا :

هذا الحمال هذا ابرربنا
لاحمال خیبر واطهر

”خیبر (جو کھجوروں کی منڈی ہے) وہاں سے بھی بوجھ اٹھایا جاتا ہے اور لادا جاتا ہے، یہ بوجھ اس جیسا نہیں ہے (بلکہ) اے ہمارے رب تو جانتا ہے یہ اس سے بہت اچھا نیکی والا اور بہت پاکیزہ ہے ۔

کبھی یہ رجز پڑھاجاتا اور سید الانبیاءﷺکی زبان مبارک بھی ساتھ ساتھ ترنم فرما ہوتی تھی[4] :

اللهم لاخیرالاخیر الأخرة فانصر الانصار والمهاجرة[5]

کبھی اس میں یہ ترمیم فرمالیتے:

اللهم ان الاجر اجرالأخرة فارحم الانصار والمهاجرة[6]

یہ مسجد اگر چہ دوسری ہے ، مگر اس لحاظ سے اولیت اس کو ہی حاصل ہے کہ جو آبادی

---

[4] بخاری شریف ص ۵۵۵ وابن سعد ص ۲ ج ۲

[5] “اے اللہ صرف آخرت کی بھلائی ہی بھلائی ہے ، پس مدد فرما انصار کی اور مہاجرین کی“

[6] “اے اللہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا اجر ہی اجر ہے جو مقصود و مطلوب ہونا چاہئے ، پس رحم فرما انصار اور مہاجرین پر“

مستقل قیام کے لئے طے فرمائی گئی اس میں پہلی مسجد یہی ہے ۔ اس بنا پر حسب ارشاد رحمۃ للعالمین ﷺ لمسجد اسس علی التقویٰ من اول یوم کا اصل مصداق یہی ہے کیونکہ قبا صرف نزول گاہ تھا اور جو مستقل قیام گاہ اور رقبۃ الاسلام تھا وہ یہی مقام ہے جہاں ناقہ نبی ﷺ نے گردن پھیلادی تھی اور جہاں تبع یمن[2] نے سیکڑوں سال پہلے خاتم الانبیاء ﷺ کے لئے نزول گاہ تعمیر کردیا تھا ۔ بس مسجد النبی ﷺ کی اولیت قیام گاہ مستقل کی اولیت ہے[3] ۔ اور مسجد قبا

---

[2] تبع بن الاقرن یمن کا بادشاہ تھا ۔ اس کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ان کو تبع ہی کہاگیا ۔ انہیں میں سے ایک تبع ایک فوجی مہم کے سلسلے میں یثرب بھی پہنچا ۔ وہ یہاں قتل عام کرکے اس آبادی کو ختم کرنا چاہتا تھا کہ اہل علم نے اس کو خبر دی کہ نبی آخرالزماں کا یہ دارالہجرۃ ہوگا ۔ وہ متاثر ہوا، برباد کرنے کے ارادے کو ملتوی کیا اوریہاں ایک مکان تعمیر کرادیا کہ آنحضرت ﷺ جب تشریف لائیں تو یہاں قیام فرمائیں اور ایک تحریر بھی لکھ کردے دی ۔ جو نسلاً بعد نسل محفوظ رہی اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی ۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس تبع کا نام اسعد تھا ۔ کنیت ابو کرب ، اس نے آنحضرت ﷺ کی شان میں دو شعر بھی کہے تھے ۔

شہدت علی احمد انہ رسول من اللہ باری النسمفلو مد عمری الی عمرہ لکنت وزیرا لہ وابن عم ترجمہ : "میں شہادت دیتا ہوں کہ احمد اس خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہونگے جو جانوں کا پیدا کرنے والا ہے اگر میری عمر ان کے زمانے تک دراز ہوگئی تو میں ان کا وزیر بھی ہونگا ۔ (سلسلے نسب کے لحاظ سے) ابن عم بھی"(معارف ابن قتیبہ ص ۲۱۱ وفاءالوفاءص ۱۳۴ ج ۱)

[3] ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آغاز کے لحاظ سے اگر چہ مسجد قبا اولیٰ ہے کہ اس کی تعمیر پہلے شروع ہوئی لیکن تکمیل کے لحاظ سے مسجد مدینہ مقدم ہے ۔

کی اولیت عارضی قیام گاہ کی اولیت ہے عارضی اور مستقل جو فرق ہونا چاہیئے وہ یہاں بھی کارفرما ہے ۔

تعمیر :

اس وقت بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی جاتی تھی ۔ لہذا قبلہ اسی طرف یعنی شمال کی جانب رکھاگیا ۔ اس طرف کی دیوار ستر ہاتھ لنبی بنائی گئی،دوسری جانب ساٹھ ہاتھ۔

بنیادیں پتھروں سے بھری گئیں ۔ تین ہاتھ کی اونچائی تک دیواریں بھی اسی پتھر سے چنی گئیں ۔ ان کے اوپر کچی اینٹوں کی تعمیر کی گئی ۔ البتہ دروازوں کے بازو پتھروں کے رہے، ساٹھ ہاتھ (تیس گز) چوڑی چھت کے سہارے کے لئے بیچ میں کھمبے (ستون) کھڑے کئےگئے تین تین کھمبوں کی دو لائنیں ایک طرف (شرقی جانب میں) اور دولائنیں غربی جانب میں۔ دونوں لائنوں کے بیچ کا حصہ وسیع رکھاگیا، میدان میں سے جو کھجور کاٹے گئے تھے ان کے کھمبے اگلی لائن میں لگائے گئے جو قبلہ کی جانب تھی ۔ چھت میں نیچے بلیاں رکھ کر ان کے اوپر کھجور کے پٹھے (شاخیں جن پر پتے ہوتے ہیں) پتوں سمیت بچھادیئے گئےہے ان کے اوپر ہلکی مٹی پھیلادی گئی اور چھپر۱ کی طرح ڈھلوان رکھی گئی، مگر پھر بھی بارش ہوتی تو ٹپکتی

ملاحظہ ہو وفاءالوفاءص ۱۷۹ ج ۱

تھی۔ نیچے پختہ فرش نہیں تھا صرف ہموار زمین تھی۔ پانی ٹپکتا تو کیچ ہوجاتی تھی۔ اسی لئے کچھ دنوں بعد چھت پر مٹی زیادہ کردی گئی اور فرش پر کنکریاں بچھادی گئیں۔ چھت کی اونچائی سات ہاتھ (ساڑھے تین گز یعنی ساڑھے دس فٹ)

تین طرف دروازے رکھے گئے ۔ قبلہ کی طرف کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب دروازے تھے ۔ [1]کچھ دنوں بعد جب بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیاگیا (جو مدینہ سے جنوب کی جانب ہے) تو اس طرف کی دیوار کا دروازہ بند کردیاگیا اور جانب شمال کی دیوار جو پہلے دیوار قبلہ تھی اس طرف دروازہ کھول دیا گیا[2]اور اسی دیوار

---

[1] وفاءالوفاءص ۲۴۲ ج ا ، اس عمارت کے لئے کوئی چندہ نہیں کیاگیا ۔ حضرات صحابہ ؓ نے پیش کرنا چاہا اور درخواست کی کہ باقاعدہ چھت ڈلوادی جائے ۔ فرمایا نہیں ۔ عریش کعریش موسیٰ خشیبات و ثمام والشان اعجل ۔ یعنی موسیٰ علیہ اسلام کے چھپر کی طرح (یہ چھت ہوگی) کہ نیچے لکڑیاں (بلیاں) ان کے اوپر پھونس ، (پھر فرمایا)، انسان کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ عجلت لئے ہوئے (نازک ہے) (ابن سعد ص ۲ج ۲ وفاءالوفاءص ۲۴۲ ج ۱)

[2] آنحضرت ﷺ نے ایک سال شب قدر کے متعلق فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میں پانی اور کیچڑ میں سجدہ کررہا ہوں۔ اس وقت بادل کا نام و نشان نہ تھا ۔ مگر دفعۃً رات کو بارش ہوئی تو واقعی صبح کو پانی اور کیچڑ میں سجدہ کرنا پڑا ۔ آنحضرت ﷺ کی پیشانی مبارک پر بھی مٹی لگی ہوئی تھی ۔(بخاری شریف ص ۲۷۰ وفاءالوفا ص ۲۴۲ ج)

[3]سے متصل وہ سائبان بنادیاگیا جو صفہ کہلاتا تھا، جو ان اصحابہ کا مسکن تھا جن کے اہل وعیال نہیں ہوتے تھے اور تعلیم، روحانی تربیت، نیز رضا کارانہ خدمات کی غرض سے یہاں رہاکرتے تھے ۔ معاش کے لئے دن کو لکڑیاں چن لیتے تھے ۔ مگر رات کی تاریکی میں تلاوت قرآن اور نوافل کے قندیل روشن رکھتے تھے ۔

ابتداءمیں منبر نہیں تھا تو ایک ستون کی برابر میں مٹی کی چوکی (چبوتری) بنادی گئی تھی۔ آقائے دوجہاں ﷺاسی پر رونق افروز ہوکر خطاب فرمایا کرتے تھے اور ستون پر سہارا لگالیاکرتے تھے ۔

حجرات امہات المومنین :

مسجد کی تعمیر سے فراغت ہوئی تو مسجد سے متصل ہی ازواج مطہرات کے لئے مکان بنوائے ۔ اس وقت تک حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نکاح میں آچکی تھیں، اس لئے دوہی حجرے بنوائے ۔ جب ازواج مطہرات آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے ۔

مسجد سے متصل حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی جائیداد تھی۔ ہر ایک مکان کے لئے وہی اپنی جائیداد کا ٹکڑا پیش کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ تمام جائیداد محبوب رب العالمین ﷺکی نذر

---

[3] وفاء الوفاء ص ۲۶۲ ج۱۔ ان حضرات کو مسجد ہی میں سونے کی اجازت تھی۔ ابن سعد ص ۱۳ ج۲ و بخاری ص ۶۳۔

کـردی ۔ مسـجد کی طـرح چـار حجـرے بھی کچی اینٹوں کے تھے اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی چھت چھــوٹے ســے صــحن کے گــرد کھجــور کی کھپچیوں (پٹھوں) کی دیواریں جن پر مــٹی لیس دی گئی تھی ۔ حضرت عائشــہ صـدیقہ ضـللہعنہا کے حجرے کا ایک کواڑ تھا ۔ بـاقی کے دروازوں پــر ٹٹیاں تھیں۔ پانچ حجرے ایسے بنائے گئے کہ ان میں کچی اینــٹیں بھی نہیں لگــائی گــئیں بلکہ ٹٹیــاں کھڑی کرکے ان پر مـٹی کِھیس دی گـئی اور اوپــر کھجور کے پٹھـوں اور پتـوں کی ہلکی سـی چھت ڈال دی گئی ۔ ان کے دروازوں پر نہ ٹٹیاں تھی نہ کواڑ، بلکہ ٹاٹ یا کمبل کے پردے پڑے رہتے تھے جــو طول میں تین ہاتھ اور عرض میں ایک ہاتھ ســے کچھ زائـدتھے ۔ چھــتیں ایســی نیچی کہ حضــرت حســن بصـری حمتللہعلیہ کـا بیـان ہے کہ حضــرت عثمـــان رضـــی اللہ تعـــالیٰ عنہ کی خلافت کـــا دورتھـــا، جب میں ذرا بــڑا ہوگیـــا تھـــا میں ان حجروں میں جاتا تــو کھـڑے ہوکر ان حجـروں کی چھتوں کو ہاتھ لگالیا کرتا تھا ۔ رات کــو گھــروں میں چــــراغ جلانے کـــا رواج نہیں تھـــا، لہذا ان حجروں میں رات کو صرف نــور حـق کی روشـنی رہتی تھی ۔

سنہ ۸۷ ھ میں اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی توسیع کی تو ان مبـارک حجـروں کــو مسـجد میں شامل کرلیا ۔

ابوامامہ حضرت سہیل بن حنیف فرمایا کــرتے

تھے ۔ کاش ان حجروں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تاکہ لوگ دیکھتے کہ جس نبی کے دست مبارک پر تمام خزانوں کی کنجیاں رکھ دی گئی تھیں اس نے خود اپنے لئے کیا پسند کیا تھا ۔[1]

صفہ واصحاب صفہ :

پہلے گذرچکا ہے کہ تبدیلی قبلہ کے بعد جب نماز جنوب کی جانب رخ کرکے پڑھی جانے لگی تو اس طرف کی دیوار میں جو دروازہ تھا وہ بند کردیاگیا اورپہلی دیوار قبلہ (شمالی دیوار) میں دروازہ کھول دیا گیا ۔ اس سے متصل چبوترہ بنادیاگیا اور اس پر سائبان ڈال دیا گیا ۔ اسی کو صفہ کہاجاتا تھا۔[2]نادار مسلمان جن کے اہل وعیال نہیں ہوتے تھے ان کا مسکن یہی ہوتا تھا۔ توکل ان کا سرمایہ ہوتا تھا ۔ سوال کرنا ممنوع، تعلیم، روحانی تربیت اور رضاکارانہ خدمات ان کے فرائض اور مشاغل ہوتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستراصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی فقط تہہ بند تھا یا صرف کمبل جس کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے ۔ کمبل بھی اس قدر چھوٹا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک

---

[1] ابن سعد ص ۱۸۱ ج ۲ وفاءالوفاءص ۳۲۷ ج ۱ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابرتابعین نے بھی اسی جذبہ کا اظہار فرمایا ۔

[2] قال عیاض الصفۃ بضم الصاد و تشدید الفاءظلۃ فی موخر مسجد النبی ﷺ یاوی الیھا المساکین۔ (وفاءالوفاءص ۳۲۱ ج ۱)

پہنچتا، کسی کے ٹخنوں تک ۔ نماز میں سترکھلنے کا خطرہ رہتا تو ہاتھ سے تھامے رکھتے تھے ۔❶

آنحضرتﷺکے پاس کھانے کی چیز صدقے میں آتی تو ان کو دیدیتے، خود تناول نہیں فرماتے تھے کیونکہ صدقہ آپ کے لئے حرام تھا ۔ جو چیز بطور ہدیہ آتی تو ان کو بلالیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ۔❷

یہ حضرات فاقے سے نہیں گھبراتے تھے کیونکہ خود اپنے آقاﷺکو دیکھتے کہ کئی کئی وقت گزرجاتے اور فاقے نہیں ٹوٹتا، بھوک سے کبھی اتنا ضعف ہوجاتا کہ نماز کی حالت میں گرپڑتے، لوگوں کو خیال ہوتا کہ دورہ پڑگیا ہے حالانکہ دورہ فاقے کا ہوتا تھا ۔❸

کبھی آنحضرتﷺان کو انصار پر تقسیم فرمادیتے کہ اپنے بساط کے موجب ہر شخص ایک ایک دو دو کو لیجائے اور اپنے ساتھ ان کو کھانا کھلائے۔❹

---

❶ بخاری شریف ص ۶۳، ج۱ و فتح الباری ص ۴۲۶ج ا

❷ ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی ﷺ ص ۵۹ج ۲ ،

❸ ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی ﷺ ص ۵۹ج ۲ ،

❹ یہ بھی صورت ہوتی کہ آپ فرمادیتے کہ جن کے یہاں دو کھانے والے ہوں وہ تیسرے کو لیجائے اور جس کے یہاں کھانے والے چار ہوں وہ دو دو کو لیجائے اور ساتھ کھانا کھلائے ۔ ایک روز آپ نے اسی طرح اصحاب صفہ کو تقسیم فرمادیا ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں چار کھانے والے تھے ۔ خود حضرت ابوبکر ، ان کے صاحبزادے اور اہلیہ اور ایک خادم مگر آپ اپنے ساتھ تین کو لے گئے ۔ آنحضرت ﷺ سات اصحاب کو لے گئے (بخاری شریف ص ۸۴ و

مسجد مبارک کے دو ستونوں میں ایک رسی بندھی رہتی تھی ۔ کھجوروں کے موسم میں حضرات انصار کھجوروں کے گچھے (خوشے) اپنے باغات سے لاکر لٹکادیتے تھے، جو کھجور پک جاتا اس کو لکڑی سے جھاڑ کر کھالیا کرتے تھے [5]۔ ان بہادر و جاں باز فقراءاور درویشان باوقار کو آنحضرت ﷺ بشارت دیا کرتے تھے ۔

لوتعلمون ما لکم عنداللہ لاحببتم ان تزدادوا فقراً وحاجۃ ۔[6]

”اگر تم جان جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لئے کیا تیار ہے تو تم آرزو کروکہ ہمارا یہ فقروفاقہ اور بڑھ جائے ۔“

ان حضرات کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی ۔

نماز جنازہ کی جگہ :

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لائے تو جس کسی بیمار کی نزعی کیفیت ہوتی (مرنے کے قریب ہوتا) تو آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی جاتی ۔ آپ تشریف لاتے اس کے لئے دعا فرماتے ۔ وہ شخص وفات پاجاتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ تجہیز وتکفین آپ کے سامنے ہی ہوتی اور آپ دفن کے وقت تک وہاں رہتے تھے۔ اس میں آپ کو بہت دیر ہوجاتی تھی۔ اس کا ہمیں احساس ہوا تو

ص ۵۰۶ وغیرہ)

[5] وفاءالوفاءص ۳۲۴ ج ۱

[6] ایضاً ص ۳۲۲ ج ۱ و ترمذی شریف باب فی معیشۃ اصحاب النبی ﷺ ص ۵۹ ج ۲ ،

ہم نے یہ کرلیا کہ وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کو اطلاع دیتے ہیں آپ تشریف لاتے، نماز جنازہ پڑھاتے پھر کبھی واپس تشریف لے جاتے اور کبھی دفن ہونے تک وہاں تشریف رکھتے ۔ پھر ہمیں محسوس ہوا کہ آپ کو اس میں بھی زحمت ہوتی ہے تو یہ طے کرلیا کہ آنحضرت ﷺ کو تکلیف نہ دی جائے گی بلکہ جنازہ لے کر خود آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کریں گے ۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا ۔ جب جنازہ لیکر کاشانہ نبوت پر پہنچے تو قریب ہی ایک جگہ تھی وہاں آپ نماز پڑھاتے ۔ پھر یہی معمول ہوگیا کہ اسی خاص جگہ پر نماز جنازہ پڑھائی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس جگہ کانام ہی موضع الجنائز پڑگیا ۔[1]

نماز باجماعت

عبادت، عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ پوجا کیا جاتا ہے ۔ اس کی حقیقت ہے غایۃ التذلل یعنی

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۴ جلد اول قسم ثانی ، آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا کہ موضع الجنائز میں نماز پڑھایا کرتے تھے جیساکہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب الصلوٰۃ علی الجنائز بالمصلی والمسجد میں پیش کی ہیں ۔ ص ۱۷۷ مگر بعض مرتبہ کسی عارض کی وجہ سے مسجد میں بھی نماز پڑھ لی ہے ۔ فتح الباری ص ۱۵۵ ج ۳ باب مذکور (اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کسی خاص ضرورت کے بغیر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے ۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جائز قرا ر دیتے ہیں (واللہ اعلم بالصواب)

انتہا درجہ عاجزی، بے چارگی، بے بسی، اسی کے اظہار کو عبودیت کہتے ہیں ۔ اپنے مالک اور خالق کے سامنے اپنی بے بسی اور عاجزی کے اظہار کے لئے جماعت کی ضرورت نہیں بلکہ گوشہ خلوت کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ پرکیف اور پرخلوص وہ عاجزی ہوتی ہے جو تنہائی میں ہو، جہاں بندہ تصور معبود میں غرق ہو ۔ معبود اور مالک کے سوا کسی کا وجود تو کیا کسی کا تصور بھی نہ ہو ۔ اسلام نے اس کو تسلیم کیا ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :❷

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (سورہ الاعراف ۵۵)

”پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے پوشیدہ طور پر “

دوسرے موقع پر ارشاد ہے :

وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَۃً وَّدُوْنَ

---

❷ فرائض کے علاوہ نوافل میں سنت یہی ہے کہ اپنے مکان میں پڑھی جائیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سید الثقلین ﷺ سے دریافت کیا کہ افضل کیا ہے ، مکان میں یا مسجد میں ۔ ارشاد ہوا تم دیکھتے ہو میرا مکان مسجد سے کتنا قریب ہے؟ اس کے باوجود اپنے مکان میں نماز پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بمقابلہ مسجد میں نماز پڑھنے کے ۔ اِلاّیہ کہ فرض نماز ہو (ابن ماجہ) ارشاد ہوا مکان میں نماز پڑھنا نور ہے لہذا اپنے مکانات کو منور کرو (ابن خزیمہ)۔ ارشاد ہوا کچھ نمازیں (نفلیں) گھروں میں پڑھاکرو اپنے مکانات کو قبریں نہ بنالو (بخاری شریف وغیرہ)۔ ایک ارشاد یہ ہے کہ جہاں لوگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں (مثلاً مسجد) ایسی جگہ نماز پڑھی جائے، اس کے مقابلہ میں گھر میں نماز پڑھنے کی وہی فضیلت ہے جو فرض نماز کی فضیلت نفل نماز پر ہے ۔ ترغیب ترہیب (بحوالہ بیہقی)

الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿٢٠٥﴾ (سورہ الاعراف، آیت ٢٠٥)

”یاد کر اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور نیاز مندی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر پکارے صبح و شام اور ایسا نہ ہو کہ تم ان میں ہوجاؤ جو غافل رہتے ہیں ۔“

لیکن جس طرح اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عبادت کو مکمل کیا ۔ مثلاً پہلی امتوں میں کسی امت کی نماز میں صرف سجدہ ہوتا تھا ۔ رکوع نہیں ہوتا تھا۔ کسی امت کی نماز میں صرف رکوع اور کسی امت کی نماز میں صرف قیام ہوتا تھا۔ کھڑے کھڑے دعائیں پڑھا کرتے تھے، نہ سجدہ کرتے نہ رکوع۔ مگر محمد رسول اللہﷺ کے ذریعے جس نماز کی تعلیم دی گئی اس میں قیام اور قعدہ بھی ہے اور سجدہ اوررکوع بھی ۔ پھر جس طرح ظاہری ارکان کے لحاظ سے مکمل ہے۔ معنی کے لحاظ سے بھی مکمل ہے کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کا اقرار ۔

پھر اس کی حمد وثناء١[1] اور اس کے ارشادات[2]اور آیات الٰہیّہ کی تذکیر، پھر جملہ نقائص سے اس کی پاکی اورعظمت[3]، اس کی پروردگاری اور بلندی و برتری کا اعتراف اور اس [4]بات کا اظہار کہ وہ حمد کرنے والوں کی حمد سنتا ہے ۔ پھر بارگاہ رب ذوالجلال میں جملہ

---

[1] سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض یا واجب ہے جس کے شروع میں ہے: الحمد للّٰہ رب العٰلمین ، الرحمن الرحیم ، مالک یوم الدینہ اور اس سورت کی اہمیت یہ ہے کہ حدیث میں اس سورت کو نماز سے تعبیر کیاگیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیاگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف تقسیم کردیا ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ مانگتا ہے (تقسیم کی تفصیل یہ ہے) کہ بندہ کہتا ہے : اَلْحَمْدُ لِلِّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِینَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثناءکی، پھر بندہ کہتا ہے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِتو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری عظمت بیان کی ، پھر بندہ کہتا ہے : اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور بندے کی درخواست منظور ہے ۔ پھر بندہ کہتا ہے اِہْدِ نَا الصِّرَاطَ الْمُستَقِیْمَ ،صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنعَمْتَ عَلَیَہِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیَہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندے نے اپنے لئے درخواست کی ہے اس کی درخواست منظور ہوگی ۔ مسلم شریف ص ١٧٠ ج ١

[2] سورہ فاتحہ کے بعد قرآن پاک کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری ہے۔ قرآن پاک میں احکام بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور توحید رسالت کے دلائل بھی ، مشاہدات یا تاریخی واقعات کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں ۔

[3] سبحان ربی العظیم رکوع میں ، سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ

[4] رکوع سے کھڑے ہوتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ (وہ اس کی سنتا ہے جو اس کی حمد کرتا ہے ۔

تعظیمات[1] کی پیش کش، اس کے رسول پر درود وسلام، پھر اپنے لئے دعا۔

اس ظاہری اور معنوی تکمیل کے ساتھ ایک خصوصیت یہ ہے کہ انفرادی عمل کو اجتماعی عمل بنایا گیا اور جوکام الگ الگ کرنے کا تھا اس میں سب کی شرکت لازم کردی گئی یعنی پانچ وقت کی نمازیں، جن کا پڑھنا ہر ایک عاقل بالغ مسلمان کے لئے ہرحالت میں ضروری ہے[2]، جن کو فرض کہاجاتا ہے ان کے متعلق نہایت تاکید[3] سے حکم ہوا کہ سب مل کر ایک ساتھ پڑھیں، ایک پڑھانے والا ہو (امام) باقی سب اس کی پیروی کرنے والے (مقتدی)۔

اس جماعت کا ایک مرکز ہونا چاہئے[4] جس کو مسجد کہاجاتا ہے، پنج وقتہ نمازوں میں ایک

---

[1] التحیات للہ والصلوٰت والطیبات۔

[2] مسافر ہو یا مقیم، بیمار ہو یا تندرست۔

[3] اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات آگے آئیں گے (انشاءاللہ) یہاں قرآن پاک کے اسلوب سے سبق لیجئے۔ قرآن پاک میں جہاں نماز کا حکم ہوا ہے عموماً جمع کا صیغہ استعمال کیاگیا ہے۔ حٰفِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ★ وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ (سورہ بقرہ ۲۳۸) اَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ اعراف ۲۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ارْكَعُوا (سورہ حج ۷۷ وغیرہ تک، نیز صلوا (نماز پڑھو) کے بجائے جگہ جگہ اقیموالصلواۃ ارشاد ہوا ہے۔ اقامہ الصلوات یہی ہے کہ نماز ایسی شان سے پڑھی جائے کہ دینداری اور خدا پرستی کی فضا بنے، کلمہ اللہ سربلند ہو شان حق نمایاں ہو۔

[4] قرآن حکیم نے اس مرکز کو یہ اہمیت دی ہے کہ ستر پوشی کا حکم دیا تو نماز کو مسجد سے تعبیر کیا، ارشاد ہے: خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ الاعراف ۳۱) ”لے لو اپنی آراستگی مسجد کے وقت (یعنی ہرنماز کے وقت)“ یعنی باقاعدہ نماز وہی ہے جو اس طرح ہوکے آپ آراستہ ہوکر مسجد میں جائیں۔“

مخصوص اور محدود حلقے (مثلاً محلے) کے خدا پرستوں کا اجتماع ہونا چاہئے ، ہفتے میں ایک مرتبہ اس سے وسیع پیمانے پر اور اسلامی تہوار یعنی عید، بقرعید کے موقع پر اس علاقے کے تمام حلقوں کا مشترکہ اجتماع، آبادی سے باہر کسی وسیع مقام پر ہونا چاہئے ۔

جماعت کے فوائد :

بیشک بندے اور خدا کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے اس کے تسلیم کرنے اور اس کے بروئے کار لانے کے لئے مظاہرے کی ضرورت نہیں ہے ۔ مگر یہ تو ضروری ہے کہ بندگان خدا میں یاد خدا کا جذبہ پیدا ہو، خدا پرستی کا رواج ہو، پرستش حق کی فضا بنے ، اللہ تعالیٰ کا نام کھلم کھلا لیا جائے ، اس کی عظمت و معبودیت کی شان دکھائی جائے تاکہ جو خدا کو بھولے ہوئے ہیں انہیں اللہ یاد آئے، جو اپنے رب سے ٹوٹے ہوئے ہیں وہ اپنا رشتہ رب سے جوڑیں ، ظاہر ہے یہ مبارک مقاصد اجتماع [5] کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے ۔

تعلیم و تبلیغ اور اصلاح کے نقطہ نظر سے فائدہ یہ ہے کہ دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے، شہری زندگی میں خدا پرستی کا رواج ہوتا ہے اس کا شوق بڑھتا ہے ، معاشی اور سماجی

---

[5] امام ابوحنیفہ ؒ نے اس اجتماع میں ایک وحدت تسلیم کی کہ امام کو اصل قرار دیا اور مقتدیوں کو اس کا تابع۔ قرأت فاتحہ اور قرأت قرآن کا فریضہ امام ادا کریگا ۔ اس کی قرأت سب کی قرأت ہوگی : من کان لہ امام فقرأة الامام لہ قرأة (الحدیث)

لحاظ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مل جل کر کام کرنے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تعاون اور اشتراک عمل کی رسم پڑتی ہے اور جب "ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں محمود وایاز" تو اخوت اور مساوات بھی نظریے کی حد سے آگے بڑھ کر میدان عمل میں جلوہ گر ہوتی ہے اور جب ایک صف میں کندھے[1] سے کندھا ملاکر سیدھے کھڑے ہوتے ہیں کہ نہ کوئی آگے نکلا ہوا ہو اور نہ کوئی پیچھے ہٹا ہو ۔ ہر ایک کا ٹخنہ دوسرے کے ٹخنے کی سیدھ میں ہو ۔ اور یہ سب خواہ ان کی تعداد لاکھوں ہو، ایک ہی امام کی آواز پر کبھی ہاتھ کانوں تک اٹھائیں، کبھی ہاتھ باندھ لیں، کبھی سیدھے کھڑے ہوں کبھی ایک ساتھ جھک جائیں، کبھی زمین پر ماتھے رکھ دیں کبھی دوزا نو بیٹھ جائیں، تو ایک عسکری تربیت اور فوجی نظم وضبط کی شکل رونما ہوتی ہے ۔ سب سے اہم بات یہ کہ مسجد مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا مرکز بھی بنی۔ یہیں ان کو انصاف مہیا کرنے کے بندوبست ہونے لگے اور یہیں مسلمانوں کی ضرورتوں، ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کے اقدامات ہونے لگے۔ غرض اس طرح کے بہت سے فائدے وجود پذیراور ظہور فرماہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جب مدینے میں آزاد

---

[1] ارشاد خداوندی ہے : اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ (سورہ صف۴) اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے ان سے جو راہ خدا میں اس طرح صف باندھ کر مقابلہ باطنی دشمن یعنی شیطان اور شیطانی جذبات سے ہوتا ہے ۔

فضــا میســر آئی اور یہ موقــع ملا کہ اللہ کانــام کھلم کھلا لیاجائے تو آنحضرت ﷺ نے جماعت کو لازم قرار دیا[2] یہاں تــک کہ حضـرات صـحابہ کــا عــام مذاق یہی بن گیا کہ جماعت کے بغیر وہ نمــاز کــو جـائز ہی نہیں سـمجھتے تھے[3] بیمـار آدمی بھی ساتھیوں کے سـہارے مسـجد میں آتـا اور جمـاعت میں شریک ہوتـا تھـا اور سسـتی وہی کرتـا تھـا جس کے دل میں نفاق ہوتا تھا ۔ پھر شہریا آبادی ہی نہیں بلکہ جہاں بھی تین مســـلمان ہوں ان کے لئے یہی حکم ہواکہ اگر وہ جمـاعت سـے نمـاز نہیں پڑھتے تو ان پر شیطان مسـلط ہوجاتـا ہے ۔ (کہ ان کے مـذہبی معـاملات درہم بـرہم ہوجـاتے ہیں ان کا صحیح نظم قائم نہیں ہوتا)

---

[2] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشــاد فرمایــا : میں نے ارادہ کیــا کہ میں لکڑیــاں جمــع کراؤں پھرنماز پڑھنے کیلئے نماز کی اذان دیـدی جـائے تـو کسی کـو کہدوں کہ وہ نمـاز پڑھـائے پھـر میں ان کے یہاں جاؤں جو جماعت میں حاضر نہ ہوں اور ان کے گھروں کـو آگ لگادوں (بخـاری شـریف ص ۸۹) انـدازہ فرمـایئے رحمتہ اللعٰلمین ﷺ جو اہل ایمان کے حق میں ایسے رؤف رحیم ہیں کہ ہر وہ بات ان کو شـاق ہوتی ہے جـو مسـلمانوں کےلـئے پریشانی کا سبب بنے، ترک جمـاعت پـر اتـنے نـاراض ہوں) کتنی ضروری ہوئی ۔

[3] قدروی عن غیرواحد من اصحاب النبی ﷺ انهم قالوا من سمع النداء فلم یجب فلاصلوٰۃ لہ (ترمذی شریف ص ۳۰)

مواخات

مہاجرین اور انصار (ضنللہعلیہمجمعین) میں بھائی چارہ

(۱)

پچاس کے قریب صحابہ کرام ضنللہعلیہمجمعین مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ آچکے ہیں، باقی آرہے ہیں ، آنے والوں میں وہ بھی ہیں جو مکہ میں صاحب حیثیت تھے ، جائیدادوں اور کاروبار کے مالک تھے، مگر اب یہ سب قرآن پاک کے الفاظ میں "الفقراء" ہیں[1]، کیونکہ نہ صرف جائیدادوں پر بلکہ ان کے مال ومتاع اور سامان واسباب پر بھی دوسروں کا قبضہ ہوچکا ہے۔

عمرفاروق ضللہعنہ جیسے رعب وداب اور دھاک کے آدمی چند ہی تھے جنہوں نے کھلم کھلا ہجرت کی ، باقی سب وہ تھے جو چھپتے چھپاتے خالی ہاتھ بمشکل تمام مدینہ پہنچے تھے ، ان کے بدن کے کپڑے بھی سالم نہیں تھے ۔ (کسی قدر تفصیل گذشتہ صفحات میں گذرچکی ہے)

(۲)

پوری دنیا میں صرف وہ مٹھی بھرجاں نثار ان، پردیسی فقراءاور تہی دستوں کے مددگار تھے جنہوں نے بیعت عقبہ کے موقع پر ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی ، مگر یہ کتنے تھے ؟

---

[1] سورہ ۵۹ حشر ، آیت ۸ ،

ان کے ذرائع کیا تھے ؟ صرف تہتر یا پچھتر جب کہ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔[❷]

(۳)

یثرب اول تو کاروباری قصبہ نہیں تھا اور جو کاروبار تھا اس پر یہودیوں کا قبضہ تھا ۔ قبیلہ اوس اور خزرج کے لوگ جن سے حضرات انصار کا تعلق تھا وہ کاشتکار تھے ۔ کسی کے پاس اپنی زمین تھی کوئی دوسروں کی زمین میں بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔جن کی زمینیں اپنی تھیں اقتصادی ڈھانچہ ان کا بھی بگڑا ہوا تھا۔ جس کے پاس جو کچھ پس انداز تھا وہ اوس اور خزرج کی آپس کی لڑائی میں ختم ہوچکا تھا جن کا سلسلہ تقریباً ایک سوبیس سال کے بعد تین چار سال پہلے ختم ہوا تھا۔

عموماً بیع سلم [❶] (بدھنی) کی شکل میں یاسود پر پیشگی رقم لے لی جاتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پوری پیداوار اس سلم یا سود کی نذر ہوجاتی تھی ۔

ان قبیلوں کے کچھ لوگ ان حالات سے مستثنیٰ تھے مگر ان میں سے چند کے سوا باقی سب صاحب جائیداد ، بڑے لوگ اپنے سابق مذہب پر قائم تھے ۔

(۴)

---

❷ جو حضرات بیعت کے موقع پر حاضر نہیں ہوسکے اور مسلمان ہوچکے تھے ان کی تعداد بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی۔

❶ بخاری شریف ص ۲۹۸ ،

اللہ کے گھر (مسجد مبارک) کی تعمیر شروع ہوئی تو رحمۃ اللعالمینﷺ کے سامنے ان درماندہ پر دیسی مہاجرین کی بودوباش کا مسئلہ بھی تھا کہ اگر ان کے رہنے کا ٹھکانا ہوجائے تو دارالھجرت میں وطن کی کچھ آسائش میسر آسکے اور پراگندہ حالی ختم ہو ۔

ممکن تھا ان کے لئے الگ محلہ آباد کردیا جاتا ۔ معاشرت کا جو فرق تھا کہ اہل مدینہ کاشتکار اور زمیندار تھے اور مہاجرین تاجر پیشہ ، شہری زندگی کے عادی ، اس کا بھی تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ان کی آبادی الگ ہوتی ۔ نئی آبادی کے لئے مالی مشکلات کا حل وہ باہمی تعاون تھا جس نے بلاکسی غیرمعمولی خرچ کے مسجد مبارک اور ازواج مطہرات کے حجرات کی تعمیر کرادی تھی ۔ لیکن علیحدہ آبادی سے مہاجرین اور انصارمیں شیروشکر جیسی یگانگت نہیں پیدا ہوسکتی تھی اور باہمی انسیت والفت کی وہ نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمائی تھی (جس کو کلام پاک میں خاص طور پر نمایاں فرمایا گیا تھا)[2] وہ مشاہدہ بن کر سامنے نہیں آسکتی تھی ۔

جن کو مساوات ، اشتراک عمل اور ایک دوسرے کے لئے ایثار واخلاص کا نمونہ دنیا کے

---

[2] ہُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ ۭ اِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۶۳﴾ (الانفال ، آیت ۶۲، ۶۳)

سامنے پیش کرنا تھا ۔ علیحدہ آبادی نے ان کے لئے مناسـب تھی نہ وہ خـود یہ علیحـدگی برداشـت کرسـکتے تھے جـو اسـلامی معاشـرہ میں اونچ نیچ کی بنیاد بن جاتی ۔

اس کے علاوہ تعلیم و تـربیت کے لحـاظ سـے جس مسـاوی سـطح کی ضـرورت تھی علیحـدہ آبادی اس کے لئے خلیج بن جاتی ۔

حضـرات مہاجرین کم و بیش دس بـارہ سـال تک برکات نبوت سے فیضـیاب ہوکر تـربیت یـافتہ عـالم و فاضـل بن چکے تھے ۔ حضـرات انصـار کی مخلصـانہ ذہانت اگـرچہ ان کے لـئے رہنمـا ہوتی تھی مگـــر اس ذہانت میں رحمتہ اللعـــالمین ، "رؤف رحیم" کا رنگ بھرنے اور حضرات انصار کو مہاجرین کی سـطح پـر لانے کے لـئے جس تواصـی بـالحق[⁹] بـاہمی احتسـاب ، افـادہ اور اسـتفادہ ، تعلیم و تعلم کی ضـرورت تھی الـگ آبـادی کی صورت میں وہ پوری نہیں ہوسکتی تھی ۔

(۵)

عرب میں عقد موالات کـا طـریقہ رائج تھـا۔ غیرقبیلہ کا آدمی کسی بھی قبیلہ میں پہنچتـا، اور ایـک معاہدہ کـرکے اس قـبیلہ میں داخـل ہوجاتا، اب اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتـا، معاہدات صلح و جنگ میں شریک رہتا اور مـرنے کے بعد اس کا ترکہ بھی اسی قبیلہ میں تقسیم کیاجاتـا ۔ حضـرات مہاجرین اور انصـار میں یہ

---

⁹ ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت کرنا ۔

عقد ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ عقد موالات کچھ روایتیں رکھتا تھا۔ ان میں ایسی روایات [1] بھی تھیں جن کو اسلام برداشت نہیں کرسکتا ۔ آنحضرتﷺ نے ان کو بدبودار [2] فرمایا ۔ اور قرآن حکیم نے انکی مخالف اور متضاد بنیادوں [3] پر اسلامی تہذیب و اخلاق کی عمارت بلند کی ۔

---

[1] ہمارے زمانہ کا سیاسی گٹھ جوڑ اور پارٹی بندی اس کا نمونہ ہے کہ حق و انصاف کا نام لینا بھی جرم ہوتا ہے ۔ جابجا، جائز و ناجائز پارٹی کی حمایت کی جاتی ہے اور اسی کو تدبر اور دانش مندی سمجھاجاتا ہے ۔

[2] دعوها فانها منتنہ بخاری شریف ص ۷۲۹

[3] زمانہ جاہلیت میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ حق پر کون ہے اور تقاضا انصاف کیا ہے ۔ صرف یہ معاہدہ (عقد موالات) ہی دلیل ہوتا تھا یعنی چونکہ ہمارا حلیف میدان جنگ میں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اس کی حمایت میں میدان جنگ میں ہوں۔ اسلام نے اس قسم کے معاہدہ ہی کو حرام قرار دیا ۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد ہے لا حلف فی الاسلام اور مسلمانوں کیلئے قرآن پاک کی خاص ہدایت یہ ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ (النساء۔ ۱۳۵) ترجمہ : مسلمانو! ایسے ہوجاؤ کہ انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے یہ اللہ کے لئے گواہی (سچی گواہی) خواہ خود تمہارے خلاف ہو یا ماں باپ اور قرابت والوں کے خلاف ہو ۔" نیز ارشاد ہے: "اگر کسی قوم سے کسی بنا پر ناراضگی بغض اور غصہ ہے تو ہرگز ایسا نہ ہوکہ یہ بغض تمہیں ابھاردے ۔ اس بات پر کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو ۔ ہرحال میں انصاف کروہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے" (سورہ مائدہ رکوع ۲ آیت ۸) "اور ایک گروہ نے اگر تمہیں خانہ کعبہ میں جانے سے روک دیا ہے جس سے تمہیں غم و غصہ ہے تو اس کا یہ اثر ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ یہ غم وغصہ تمہیں اس بات پر ابھاردے کہ تم زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستور تو یہ ہونا چاہئے کہ نیکی اور

اب یہ پیغمبرانہ تدبر تھا کہ عقد موالات کے بجائے آپ نے عقد مواخات کی بنیادڈالی ۔

(۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں حضرات مہاجرین و انصار (رضی اللہ علیہم اجمعین) کا اجتماع ہوا ، یہ کل نوے حضرات تھے۔ پینتالیس مہاجرین ، پینتالیس انصار ، آنحضرتﷺ نے اپنی صوابدید کے موجب ان میں سے ایک ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا نام بنام بھائی قرار دے دیا ۔ یہ رحمۃ اللعالمینﷺ کی پیغمبرانہ فراست اور مردم شناسی تھی کہ جن کو آپ نے بھائی بنایا فطری طور پر ان کے مزاج برادرانہ تھے۔ وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور مددگار بن گئے اور مزاجوں کی موافقت کے ساتھ جب حضرات مہاجرین سے لِلّٰہِیَّت اور اعلیٰ اخلاق کا بھی ظہور ہوا تو حضرات انصار کے اخلاص نے عقیدت کی شان اختیار کرلی ۔

ام العلاء رضی اللہ عنہا ایک انصاری خاتون تھیں جن کے گھرانے کے حصے میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ آئے تھے۔ وہ اپنے مہمان کی اتنی معتقد ہوگئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ام العلاء رضی اللہ عنہا نے بڑے وثوق سے کہا : شہادتی علیک لقد اکرمک اللّٰہ یعنی میں قسم کھاکر کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً آپ

پرہیزگاری کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کے کام میں مدد نہ کرو)“۔ (سورہ ۵ مائدہ آیت ۲)

کو بخش دیا ہے ۔[1]

رشتہ اخوت اور حضرات انصار کا ایثار

وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ (سورہ نساء۔ ۳۳)

”اورجن سے اقرار باندھا تم نے ان کو پہنچاؤ ان کا حصہ (شاہ عبدالقادر)

عرب میں عقد موالات کا اثر مرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولیٰ (جس سے یہ معاملہ ہوتا تھا) وہ چھٹے حصے کا مستحق ہواکرتا تھا ۔ مندرجہ بالا آیت کے بموجب رشتہ اخوت کا اثروفات کے بعد ظاہر ہونا چاہئے تھا کہ ایک دوسرے کا وارث ہوتا ۔ مگر حضرات انصار نے بیعت عقبہ کے سلسلے میں جب دعوت دی تھی تو امداد کا وعدہ بھی کیاتھا ۔ آقاءدوجہاں ﷺ نے جب رشتہ اخوت قائم فرمایا تو حضرات انصار کی مخلصانہ اور ایثار شیوہ ذہانت نے اس کے معنیٰ یہ سمجھے کہ امداد کا طریقہ برادرانہ ہونا چاہئے

---

[1] آنحضرت ﷺ نے اس طرح وثوق کرلینے اور قسم کھانے کو پسند نہیں فرمایا۔ کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا ۔ آپ نے تعلیم دی کہ یہ کہنا چاہئے کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہوگا ۔ (بخاری شریف ص ۱۶۶) مگر حضرت ام العلاؓ کا یہ وثوق اور یقین اس بنا ءپر تھا کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے غیرمعمولی تقویٰ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق نے ان کو گرویدہ اور معتقدبنادیا تھا ۔

امداد کرنے کے لئے املاک تقسیم نہیں کی جاتی مگر برادرزندگی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ لہذا حضرات انصار نے فیصلہ فرمایا کہ مہاجر بھائیوں کو اپنی زندگیوں میں برابر کا شریک بنالیں ۔ چنانچہ دربار رسالت میں درخواست پیش کردی :

اقسم بیننا وبی اخواننا النخیل❷

"ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم فرمادیجئے ۔"

منصوبہ یہ تھا کہ بھائیوں کا حصہ بھائیوں کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ وہ اس کو اپنی ملک سمجھیں، اپنی صوابدید کے بموجب اس میں تصرف کریں اور فائدہ اٹھائیں لیکن رحمت عالم ﷺ کی شفقت نے یہ منظور نہیں فرمایا کہ حضرات انصار کی املاک سے ان کی ملکیت ختم ہو ۔ دوسری طرف دشواری یہ تھی کہ خود حضرات انصار کا جو مقصد تھا وہ اس پیشکش سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ حضرات انصار کا مقصد تو یہ تھا کہ مہاجرین کی مالی مشکلات ختم ہوں لیکن اس طرح تقسیم کے بعد حضرات مہاجرین "صاحب زمین" ضرور ہوجاتے مگر یہ حضرات تاجر پیشہ کاشتکاری اور زراعت سے ناواقف تھے۔ وہ ان افتادہ زمینوں سے پیداوار کرکے وہ امداد حاصل نہیں کرسکتے تھے جس کے لئے حضرات انصار نے یہ ایثار کیاتھا ۔

---

❷ بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

رحمت عالم ﷺ نے حضرات انصار کو اس دشواری کی طرف توجہ دلائی ۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: امداد کی صورت یہ ہے کہ زمین و باغ کے بجائے پیداوار کا حصہ مہاجرین کو دو ۔

باغات کی خدمت اور زمین میں کاشت کی ذمہ داری آپ صاحبان لیں اور پیداوار مہاجرین کو دیدیں ۔❶

حضرات مہاجرین نے بھی یہی فرمائش کی : کام کی ذمہ داری آپ لیں اور پیداوار میں ہمیں شریک کرلیں ۔

حضرات انصار نے جیسے ہی یہ تجویز سنیں ، دفعۃً ان کے جذبات کی صدا بلند ہوئی :

"سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا"(ہم نے سن لیا ہے ہم پوری پوری تعمیل کرینگے۔ البقرۃ۲۸۵) دنیا نے بہت سے انقلاب دیکھے مگر اس انقلاب کی کوئی مثال چشم عالم کے سامنے نہیں آئی کہ مالک خود اپنی مرضی سے کاشتکار اوراجنبی لوگ پردیس سے آئے ہوئے خودبخود حصہ دار بن گئے ۔❷

---

❶ البدایہ والنہایہ ص ۲۲۹ ج ۳ و ص۲۲۸ج ۳

❷ عام طور پر یہی صورت ہوئی اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی کہاکہ زمینیں اور باغ لے لیا اور خود کام کیا ۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہ کو جو درخت دیئے گئے تھے وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہیں اوراپنی ملک ہی سمجھتی رہیں ۔ حتیٰ کہ جب ان سے واپس کرنے کو کہا گیا تو تیار نہ ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے تقریباً دس گنی جائیداد دیکر ان کو واپس کرنے پر راضی کیا (ص ۷۹ و ۸۰ ج ۴ البدایہ والنہایہ بحوالہ مسند احمد) علامہ علی بن برہان الدین حلبی ؒ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات انصار کی پیش کش اگرچہ یکساں تھی کہ وہ اپنی

حضرات انصار رضی اللہ علیہم اجمعین کا تصور یہی تھا اگرچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو منظور نہیں فرمایا ۔ حضرات مہاجرین کی حیثیت کو عارضی قرار دیا ۔ چنانچہ جب حضرات مہاجرین کو افتادہ زمینیں مل گئیں تو حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کردی گئیں ۔

یہ ایثار کیوں تھا؟

قرآن شریف میں ہم بھی پڑھتے ہیں :

اِنَّمَا ہٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَ اِنَّ الْاٰخِرَۃَ ہِیَ دَارُ الْقَرَارِ

(سورہ المومن ۔ ۳۹)[1]

"یہ دنیا (موجودہ زندگی) صرف چند دن کا کام چلانا ہے اور برت لینا ہے۔ بیشک آخرت ہی ٹھیراؤ (مستقل قیام) کا مقام ہے ۔"

وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَہِیَ الْحَیَوَانُ (سورہ العنکبوت ۔ ۶۴)

"بیشک اصل زندگی عالم آخرت ہے "

نصف املاک دینا چاہتے تھے۔ مگر حضرات مہاجرین میں سے بعض نے تو اس کو اس صورت سے منظور کیا کہ حضرات انصار ہی کام کرینگے اور ان کی پیداوار مہاجرین حضرات کودیتے رہیں گے اور بعض نے ان اراضی کو بطور بٹائی منظور کیا کہ وہ خود کام کریں گے اور نصف حصہ انصار کو دیتے رہیں گے۔ (سیرۃ حلبیہ ص ۲۹۷ ج ۲)۔ مگر اس دوسری صورت میں کوئی خاص ایثار نہیں ہے۔ حالانکہ حضرات انصارکا ایثار اتنا تھا کہ مہاجرین حضرات کو یہ فکر ہوگیا کہ تمام اجر وثواب یہ سمیٹ لینگے ہم تہی دامن رہ جائیں گے ۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[1] یہ جوزندگی ہے دنیا کی سوبرت لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے ٹھیراؤ کا گھر " (حضرت شاہ عبدالقادر)

وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ (سورہ مزمل ۔ ۲۰)

”اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے بھیج دوگے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤگے ۔“

ہمارا عقیدہ یہی ہے اور بلاشبہ ان آیتوں پر ہمارا ایمان ہے ۔ لیکن ہمارے ایمان و عقیدہ کو یقین کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو مشاہدہ کی شان رکھتا ہو ۔ پھر مشاہدہ بھی غلطی کرجاتا ہے ۔ ہماری آنکھیں آفتاب کو گردش کرتا ہوا دیکھتی ہیں ۔ ہر صبح و شام کو طلوع و غروب ہمارا مشاہدہ ہے۔ لیکن سائنس کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ غلط ہے ۔ آفتاب گردش نہیں کرتا زمین گھومتی ہے۔ جب مشاہدہ بھی غلط ہوجاتا ہے تو یقین کا کوئی اور درجہ بھی ہوسکتا ہے جو مشاہدہ سے بالا ہو ۔ جو سراسر یقین ہی یقین ہو ۔ اس میں کسی طرح بھی شک و شبہ یا کسی قسم کے احتمال کی گنجائش نہ ہو۔ جس کو اصطلاحاً عین الیقین[2] کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ علیہم اجمعین کو یقین کا یہی درجہ[3]

---

[2] مشاہدہ آتش یقین پیدا کردیتاہے کہ یہ آگ ہے اور یہ جلاتی ہے ۔ لیکن جو یقین آتش سوزاں میں بھسم ہونے والے کو ہوسکتا ہے وہ صرف مشاہدہ کرنے والے یا ناپنے والے کو نہیں ہوسکتا۔ جلنے اور خاکستر ہونے والے کا یقین ہی ہے عین الیقین ہے۔

[3] یہی عین الیقین صحابہ کرام کی افضلیت کا سبب ہے کیونکہ امت میں یہ درجہ کسی کوبھی حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ امت میں کسی کو بھی یہ شرف حاصل

حاصل تھا ۔ اسی یقین کی بنا پر حضرات انصار اپنی جائیدادیں تقسیم کرنے پرخوش تھے کہ ہم نے آخرت کی حقیقی زندگی کے لئے بہت بڑا سرمایہ حاصل کرلیا اور جس کوراہ خدا میں اپنی ملک سے نکالا اس پر ابدی اور لازوال ملک کی مہرلگ گئی جو کبھی مٹنے والی نہیں ہے ۔ دوسری طرف اسی یقین اور عین الیقین نے ان حضرات مہاجرین کے پاک دلوں میں اضطراب پیدا کردیا جو مفت میں صاحب جائیداد اور زمیندار بن گئے تھے،اضطراب اس پر تھاکہ حضرات انصار کے اس ایثار کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اجروثواب کا ہر ایک درجہ حضرات انصار ہی حاصل کرلیں گے ۔ (رضی اللہ علیہم اجمعین) ہم اس درجات تک نہیں پہنچ سکیں گے ۔

چنانچہ حضرات مہاجرین نے اپنے آقا کی خدمت میں(ﷺ) عرض کیا :

”یارسول اللہ جن لوگوں میں ہم آکر اترے ہیں ہماری چشم بصیرت نے ان جیسے ہمدرد وغمگسار نہیں دیکھے ۔ تنگی ہو یا فراخی ان کی ہمدردی میں فرق نہیں آتا ۔ اپنی جائیداد یں ہمیں دیں پھر کام کی ذمہ داری بھی خود لے لی ۔ محنت وہ خود کریں گے اور نفع میں ہمارا حصہ لگائیں گے پس سارا اجروثواب وہی سمیٹ لیں گے۔“

آنحضرتﷺ نے حضرات مہاجرین کو اطمینان

نہیں ہے کہ صادق مصدوق محمد ﷺ کی زبان مبارک سے بالمشافہ کوئی ارشاد سنا ہو جس سے یقین کا آفتاب روشن ہوا ہو ۔

دلایا کہ :

”اگر تم ان کا احسان ❶ مانو اور ان کے لئے دل سے دعا کرتے رہو تو تمہارا ثواب بھی کم نہ ہوگا۔“❷

حضرات انصار کے اسی یقین کا یہ اثر تھا کہ جو ایثار کرچکے تھے اس پر وہ قانع نہیں تھے ۔ چنانچہ جائیداد کے اس بٹوارہ کے بعد بھی ان کا دست کرم کو تاہ نہیں ہوا وہ ان کی طرف بھی بڑھتا رہا جنہیں جائیداد نہیں ملی تھی جو گرہستی اور صاحب اہل وعیال نہیں تھے ، یہ اصحاب صفہ تھے ان کی خدمت بھی وہ اپنا فرض سمجھتے تھے ۔

---

❶ ہمارے ایک بزرگ تحریر فرماتے ہیں : دعا کا احسان درہم ودینار کے احسان سے کم نہیں ہے ۔ پھر فرماتے ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ضاللہعنہ کے یہاں جب کوئی سائل آتا اور دعائیں دیتا جیسا کہ سائلوں کا طریقہ ہے تو ام المومنین بھی اس فقیر کو دعائیں دیتیں اور بعد میں خیرات دیتیں۔ کسی نے کہا : اے ام المومنین آپ سائل کو صدقہ بھی دیتی ہو اور جس طرح وہ آپ کو دعا دیتا ہے آپ بھی دعا دیتی ہیں ۔ فرمایا: میں اگر اس کو دعا نہ دوں اور فقط صدقہ دوں تو اس کا احسان مجھ پر زیادہ رہے گا کیونکہ دعا ، صدقہ سے کہیں بہتر ہے، اس لئے دعا کی مکافات دعا سے کردیتی ہوں تاکہ میرا صدقہ خالص رہے دعا کے مقابلہ میں نہ ہو ۔ کذانی المفاتح شرح المصابیح ۔ لہذا جو شخص دراہم معدودہ دیکر مخلصانہ دعاؤں کا سودا کرسکتا ہے وہ کبھی نہ چوکے اور اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے دعا ضرور حاصل کرے ۔

جمادے چند دادم جاں خریدم   بحمد اللہ زہے ارزاں خریدم

سیرۃ المصطفٰی ازحضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ص ۳۳۱ ج ۱

❷ البدایہ اولنہایہ ص ۲۲۸ج ۱

ایثار واخلاص کی مثالیں

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ (سورہ حشر۹)

”اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو “

اس آیت میں حضرات انصار کی جوخصوصیت بیان فرمائی گئی اس کی مثال[1]حضرت ابوطلحہ کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ :

ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرتﷺ کی خدمت میں آیا کہ یارسول اللہ میں سخت بھوکا ہوں[2]۔ آپ نے گھروالوں سے دریافت کرایا کچھ کھانے کوہے ؟ ہر ایک گھرسے جواب آیا صرف پانی ہے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا : کوئی صاحب ان کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں ؟ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا : میں حاضر ہوں ، غرض وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر میں جاکر بیوی سے کہا : رسول اللہ ﷺ کے مہمان کی عزت کرو (ادب و احترام سے مدارات کرو) اہلیہ محترمہ نے کہا:

---

[1] ایک اور مثال بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک صاحب کو بکری کی سری پیش کی گئی۔ انہوں نے کہا فلاں صاحب اور ان کے بچے زیادہ ضرورت مند ہیں چنانچہ سری ان کے یہاں بھیجی گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے صاحب کانام لے کراور ان کی ضروریات ظاہر کرکے ان کے یہاں بھجوادی۔ اسی طرح سات آدمیوں میں گھوم کر پہلے شخص کے پاس آئی ، ہرایک دوسرے کو اپنے سے مقدم رکھتا تھا (ص ۹۵ ج ۷ فتح الباری بحوالہ ابن مردویہ)

[2] فتح الباری ص ۹۴ ج ۷

صرف بچوں کے سہارے کا کھانا موجود ہے ۔
حضرت ابو طلحہ نے فرمایا : جو کچھ ہے، تیار کرو ، چراغ[3] روشن کرلو بچوں کو بہلاکر سلادو۔ محترم خاتون نے ایسا ہی کیا۔ کھانا تیار کیا چراغ جلایا جب کھانے بیٹھے تو یہ خاتون اٹھیں بظاہر اس لئے کہ چراغ کی بتی بڑھادیں (لوتیز کردیں) مگر بڑھانے کے بجائے میاں بیوی کی آپس کی تجویز کے مطابق چراغ بجھادیا ۔ اندھیری میں کھانا شروع[4] کیا ۔ میاں بیوی صرف ہاتھ اور منہ چلاتے رہے گویا کھارہے ہیں ، کھایا کچھ نہیں بھوکے پیٹ رات گزاری ۔[5]

یہ تھا ایثار۔ اب اخلاص ملاحظہ فرمایئے کہ آنحضرت ﷺ نے ظاہر فرمادیا تھا کہ اقتدار میں حضرات انصار کا حصہ نہیں ہوگا۔ ان کے مقابلہ میں دوسروں کو بڑھایا جائے گا۔ مگران حضرات کو نہ اپنے اقتدار کی طلب تھی نہ اولاد کے لئے۔ وہ خود بھی عشق مولا میں گم تھے۔ اسی عشق کا متوالا اپنی اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے ۔ ان کو اپنے آقا محمد ﷺ کی خوشنودی مطلوب تھی اور اس آقا کی خوشنودی کے ذریعہ تمام آقاؤں کے آقا حضرت حق جلّ مجدہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ ان کو اس پر ناز تھا کہ جہاں یہ

---

[3] گویا مہمان کے اعزاز میں۔ کیونکہ کسی ضرورت سے ہی چراغ جلایا جاتا تھا، ورنہ عام طور پر گھرمیں چراغ جلانے کا دستور نہیں تھا۔ بخاری شریف ص ۵۶

[4] عام عادت تھی اس لئے دوبارہ چراغ جلانے کا اہتمام نہیں کیاگیا ۔

[5] بخاری شریف ص ۵۳۵ و ص ۵۳۶

پیشن گوئی کی جاتی تھی :

انکم ستلقون بعدی اثرة "تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسروں کو تم پر ترجیح دیجائیگی" ۔ ان کو بڑھایا جائے گا تم کو نظر انداز کیا جائے گا۔

وہاں بشارت بھی ساتھ ساتھ دی جاتی تھی ۔

فاصبرواحتی تلقونی وموعدکم الحوض[1]

"صبر کرنا یہاں تک کہ تمہاری میری ملاقات ہو اور ملاقات کا مقام حوض کوثر ہوگا ، اسی کا وعدہ ہے۔"

اور جب ان حضرات کے ایثار و اخلاص کا یہ عالم ہے تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ جس کی ایک نظر نے پوری جماعت میں یہ اخلاص و ایثار پیدا کیا وہ خود اخلاص و ایثار سے تہی دامن ہو (معاذ اللہ) اور کیا محمد رسول اللہ کے ایثار ، اخلاص اور آپ کی صداقت وحقانیت کی یہ کھلی ہوئی دلیل نہیں ہے ؟

صلوٰت اللہ علیہ وعلیٰ اصحابہ الکرام واتباعہ اجمعینہ اٰمین

اخلاص و للہیت کی انتہا

جو آپ کے کام آئے وہ بہتر ہے اُس سے جو ہمارے پاس رہے

وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (الاعلیٰ ۱۷)

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ

---

[1] بخاری شریف ص ۵۳۵

حَاجَۃً مِّمَّآ اُوْتُوْا(سورۃ حشر ۔ ۹)

"محبت کرتے ہیں ان سے جو وطن چھوڑ کر آئے ان کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی رشک اس سے جودیا جائے مہاجرین کو۔"

سنہ ۴ ھ میں قبیلہ نبی نضیر کے یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کو شہید کردینے کا منصوبہ بنایا۔ وہ کامیاب نہیں ہوئے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان کے شر سے محفوظ رکھا ۔ مگرظاہر ہے ان کے اس منصوبہ سے وہ معاہدہ ختم ہوگیا جو بقاءباہم کے متعلق سنہ ۱ ہجری میں ہوا تھا ۔

(تفصیل آگے آئے گی) لامحالہ ان کو وہ سزادی گئی جو ازروئے معاہدہ لازم تھی یعنی ان کو اس علاقہ سے خارج کردیاگیا، انکی جائیدادیں اسلامی محروسہ میں داخل ہوئیں۔چونکہ یہ علاقہ جنگ کے بغیر قبضہ میں آیاتھا تو اس کو مجاہدین پر تقسیم نہیں کیاگیا بلکہ وحی الٰہی ❷نے اس کو خاص رسول اللہ ﷺ کا حق قرار دیا۔❶

---

❷ سورہ ۵۹ الحشرآیت ۶

❶ اس وقت تک مملکت کی ضرورتیں بھی غیرمعمولی تھیں کہ ایک مملکت کی بنیادرکھی جارہی تھی اور حضرات مہاجرین و انصار میں اگرچہ ایسے صاحب استطاعت بھی تھے جو ضروریات زندگی فراہم کرسکتے تھے مگر کچھ ایسے تہی دست بھی تھے کہ فاقہ کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا تو اگر یہ جائیداد مجاہدین پر مساویانہ تقسیم کردی جاتی تو نہ مملکت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکتی تھیں نہ فاقہ زدہ انصار و مہاجرین کو قابل اعتماد امداد مل سکتی تھی ۔ اب قرآن پاک کے الفاظ میں ان جائیدادوں پر آنحضرت ﷺ کا تسلط تسلیم کرایاگیا ۔ وَّ لٰکِنَّ اللہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ (حشرآیت ۶) یعنی تمام جائیداد پر آپ کا اختیار تمیزی تسلیم

رسول خدا رحمۃ اللعالمین ؐ کے سامنے سب سے پہلے حضرات صحابہ کی مشکلات تھیں ۔ آپ نے حضرات انصار کو جمع فرماکر استصواب فرمایا کہ اس علاقہ کی اراضی انصار اور مہاجرین دونوں کو دی جائیں یا صرف حضرات مہاجرین کو دی جائیں تاکہ وہ حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کردیں اور ان کے مکانات خالی کردیں ؟

ارشاد گرامی کا جواب دینے کے لئے قبیلہ اوس اورخزرج کے دونوں سردار سعد بن عبادہ (خزرج) ، سعد بن معاذ (اوس) کھڑے ہوئے ۔ عرض کیا یارسول اللہ جوکچھ آپ تقسیم فرمائیں حضرات مہاجرین کو تقسیم فرمادیں ہمیں نہ اپنے مکانات کی ضرورت ہے نہ جائیدادوں کی ۔ بلکہ ہم بہت خوش ہونگے اگر ہماری جائیدادوں اور ملکیتوں میں سے کچھ اور مہاجرین کو عنایت فرمادیں ،جو راہ خدا میں وطن سے بے وطن ہوئے ، گھروں سے اجڑے ، جائیدادوں سے محروم ہوئے ۔

آنحضرت ؐ نے یہ حوصلہ مندانہ جواب سنا تو مطمعن ہوئے اور دعا دی :

اللهم ارحم الانصار وابناءالانصار

(اے اللہ رحم فرما انصار پر اور انصار کی اولاد پر)

کیاگیا تو آپ نے مساویانہ تقسیم کے بجائے ایسا بندوبست فرمایا کہ افراد کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور جماعت کی اقتصادی اور جنگی ضرورتوں کو بھی مدد مل سکی ۔ واللہ اعلم

اور بعض دوسری روایتوں میں تیسرا لفظ ابناءابناءالانصار بھی ہے ۔

اب آپ نے اس علاقے کا ایک حصہ حضرات مہاجرین کو عنایت فرمایا، حضرات انصار میں سے دو صاحب بہت ضرورت مند تھے ، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ ان کو کچھ جائیداد عطافرمائی، باقی علاقہ اپنے پاس رکھا جس میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے کاشت ہوتی تھی❷اور اسکی آمدنی میں سے ازواج مطہرات کا نفقہ ادا فرماتے تھے، باقی تمام آمدنی مسلمانوں کی جماعتی❸ اور انفرادی خصوصاً جہاد کی ضرورتوں میں صرف کردیتے تھے ۔

بہرحال حضرات انصار نے نہ صرف یہ کہ اس زمین میں حصہ لینے سے معذرت کردی بلکہ اپنی باقی جائیدادوں کے متعلق بھی پیش کش کردی ، یہ ہے عملی مثال اس بلندی حوصلہ اور وسعت قلب کی جس کو زیب عنوان آیت میں سراہا گیا ہے ۔

چند سال بعد بحرین کا علاقہ محروسہ اسلامیہ میں داخل ہوا تو آنحضرت ﷺ نے چاہا کہ حضرات انصار کو کچھ زمینیں عطافرمادیں، مگر حضرات انصار نے ان کے لینے سے صرف انکار ہی نہیں بلکہ بضد ہوگئے کہ جتنی زمینیں ہمیں

---

❷ السیرۃ الحلبیہ ص ۲۹۷ ج ۲

❸ فیجعلہ فجعل مال اللہ ، بخاری شریف ص ۵۷۵ و ص ۸۰۷ وغیرہ فی السلاح والکراع عدۃ فی سبیل اللہ (ص ۷۲۵ بخاری شریف و قسطلانی)

عطافرمائی ہیں اتنی ہی حضرات مہاجرین کو بھی عنایت فرمادیں۔ اتنی گنجائش نہیں تھی ۔ ارشاد ہوا :

امالافاصبرواحتی تلقونی انہ سیصبکم اثرۃ

(بخاری شریف ص ۵۳۵)

اگر آپ صاحبان منظور نہیں کرتے تو صبر سے کام لویہاں تک کہ تم (حوض کوثر پر) مجھ سے ملوگے (یعنی اس ایثار کے جواب میں ایثار نہیں ہوگا) بلکہ تمہیں ترجیحات سے واسطہ پڑے گا کہ دوسروں کو تم پر مقدم رکھا جائے گا۔ تمہارے حقوق کا لحاظ نہیں رکھاجائے گا ۔

اسماءگرامی برادران مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم

رجسٹروں کو اس وقت توفیق نہیں ہوئی تھی کہ حضرات صحابہ کے اسماءگرامی اپنے صفحات میں محفوظ کریں اور بھائی بننے والوں کو لکھاوٹ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تاہم راوی حضرات کے سینوں نے جونام محفوظ رکھے عیون الاثر فتح الباری وسیرۃ ابن ہشام کے حوالے سے یہاں درج کئے ہیں:

حضرات مہاجرین	حضرات انصار	حضرات مہاجرین	حضرات انصار
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ	حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ	عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ

عمربن الخطاب ضللہعنہ	عتبان بن مالک ضللہعنہ	ابومرثد ضللہعنہ	عبادہ بن صامت ضللہعنہ
ابوعبیدہ بن الجراح ضللہعنہ	سعد بن معاذضللہعنہ	عبداللہ بن جحش ضللہعنہ	عاصم بن ثابت ضللہعنہ
عبدالرحمن بن عوف ضللہعنہ	سعد بن ربیع ضللہعنہ	عتبہ بن غزوان ضللہعنہ	ابودجانہ ضللہعنہ
زبیربن عوام ضللہعنہ	سلامہ بن سلامہ وقش ضللہعنہ	ابو سلمہ بن عبدالاسد ضللہعنہ	سعد بن خثیمہ ضللہعنہ
عثمان بن عفان ضللہعنہ	اوس بن ثابت ضللہعنہ	عثمان بن مظعون ضللہعنہ	ابوالہیثم بن تیہان ضللہعنہ
طلحہ بن عبیداللہ ضللہعنہ	کعب بن مالک ضللہعنہ	عبیدہ بن الحارث ضللہعنہ	عمیربن الحمام ضللہعنہ
سعید بن زید ضللہعنہ	ابی بن کعب ضللہعنہ	طفیل بن الحارث ضللہعنہ	سفیان نسرخزرجی ضللہعنہ
مصعب بن عمیرضللہعنہ	ابوایوب انصاری ضللہعنہ	صفوان بن بیضاءضللہعنہ	رافع بن معلیٰ ضللہعنہ
ابوحذیفہ	عبادبن	مقداد	عبداللہ بن

بن عتبہ ضللہعنہ	یشر ضللہعنہ	ضللہعنہ	رواحہ ضللہعنہ
عمار بن یاسر ضللہعنہ	حذیفہ بن یمان ضللہعنہ	ذوالشمالین ضللہعنہ	یزید بن الحارث ضللہعنہ
ابوذرغفاری ضللہعنہ	منذر بن عمرو ضللہعنہ	ارقم ضللہعنہ	طلحہ بن زید ضللہعنہ
سلمان الفارسی ضللہعنہ	ابوالدرداءعویمربن ثعلبہ ضللہعنہ	زیدبن الخطاب ضللہعنہ	معن بن عدی ضللہعنہ
بلال ضللہعنہ	ابودریحہ عبداللہ بن عبدالرحمن ضللہعنہ	عمروبن سراقہ ضللہعنہ	سعد بن زید ضللہعنہ
عاقل بن بکیر ضللہعنہ	مبشربن عبدالمنذرضللہعنہ	عکاشہ بن محصن ضللہعنہ	مجذر بن وماء ضللہعنہ
خنیسبن حذاقہ ضللہعنہ	منذر بن محمدضللہعنہ	عامر بن فہیرہ ضللہعنہ	حارث بن صمہ ضللہعنہ
سرہ بن ابی رھم ضللہعنہ	عبادہ بن الخشخاش ضللہعنہ	مجع مولیٰ عمربن الخطاب ضللہعنہ	سراقہ بن عمروبن عطیہ ضللہعنہ

مواخات قبل ہجرت

تعاون وتناصر اورافادہ واستفادہ کی ضرورت جیسی مدینۂ طیبہ میں تھی ہجرت سے پہلے مکۂ معظمہ میں بھی تھی، کیونکہ اس سے بے سہاروں کو سہارا مل جاتا تھا اور بے پناہوں کو پناہ ۔ چنانچہ بقول علامہ حافظ ابن عبدالبر :مکہ میں بھی رشتہ اخوت مواخات کے ذریعہ مضبوط کیاگیا تھا ۔ یہ برادران مہاجرین ۱۸ تھے ۔ ان کے مبارک اسماءگرامی سے اس صفحہ کو آراستہ کیاجارہا ہے ۔

۱۔ سیدنا ومولانا محمدرسول اللہ ﷺ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

۲۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ

۳۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ

۴ حمزہ رضی اللہ عنہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

۵۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

۶۔ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ بلال بن رباح رضی اللہ عنہ

۷۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

۸۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ

۹۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ طلحہ بن

عبیداللہ ضلاعنہ

(ماخوذ از عیون الاثر ص ۱۹۹ ج ۱، حافظ ابن سیدالناس)

مسجد اور حجرات کی تعمیر اور مواخات پردوبارہ نظر

اقتصادی تعمیر، بنیادی نظریہ ، طریقہ تعمیر اور دورحاضر کی اقتصادی تحریکات

محمد رسول اللہ (فداہ روحی) ﷺ اور حضرات مہاجرین جو مسجد کی اور پھر حجروں (ازواج مطہرات کے بیوت) کی تعمیر کررہے ہیں ، اسی شہر کے رہنے والے ہیں جو ملک عرب کا مرکزی شہر ہے، جو اپنے تمدن میں دنیا کے متمدن شہروں سے پیچھے نہیں ہے۔ جس کی آبادی باقاعدہ ہے ۔ مختلف محلوں میں بٹی ہوئی ہ بیچ میں سڑکیں ، بازار پررونق ، مکانات پختہ ، ہرطرح کی آرائش سے آراستہ۔ ایک مکان وہ بھی ہے جس کو "دارالقواریر"[۱] کہاجاتا تھا ۔ (شیش محل) آنحضرت ﷺ اور آپ کے مہاجر رفقاءنے انہیں محلوں میں پرورش پائی تھی، انہیں گلیوں اور کوچوں میں کھیلے تھے۔ انہیں سڑکوں پر دوڑے اور چلے تھے ۔ پھر تاجر بن کر انہیں بازاروں میں خریدوفروخت کرتے رہے تھے ۔

دارالہجرت (مدینہ طیبہ) میں جب یہ حضرات خود مزدور اور معمار بن کر کچی اینٹوں ، چھوٹے بڑے ناہموار پتھروں ، کھجور کی ٹٹیوں اور

---

[۱] معجم البلدان

کھجور کے پٹھوں اور پتوں سے مسجد مبارک اور حجروں کی تعمیر کررہے تھے، تو اپنے خاندانی مکانات اور مکے کے محلات کا نقشہ ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا۔ نبوت کے ابتدائی تین سال میں جو تربیت دی گئی تھی اس کا نصاب اور طریقہ تربیت پہلے گذرچکا ہے ۔ یہ تربیت صرف تین سال تک ہی نہیں رہی بلکہ قیام مکہ کی پوری مدت میں اس کا سلسلہ جاری رہا اور وہ رنگ جو پہلے تین سال میں کھلا تھا وہ پختہ اور زیادہ پختہ ہوتا رہا ۔ بلاشبہ یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ تمدن کے تمام نقشوں کو چھوڑ کر جفاکش، زاہدانہ اور درویشانہ زندگی کا نقشہ جمایا جارہا ہے ۔

مگر قرآن پاک میں حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد تو یہ ہے :

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ (سورہ الاعراف ۔ ۳۲)

”تو کہہ! کس نے منع کیا ہے رونق اللہ کی جو پیدا کی اُس نے اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی۔ تو کہہ وہ ہے ایمان والوں کے واسطے دنیا کی زندگی میں نری (مخصوص طور پر) اُن کی ہیں قیامت کے دن۔“

پھر زینت سے یہ اجتناب کیوں ؟

آپ کو فراموش نہ ہونا چاہئے کہ حضرات صحابہ نے اس دور کو تعمیر ملت کا دور اول قرار دیا تھا۔ چنانچہ اسی سال کو اسلامی سنہ (سنہ

ہجری کا پہلا سال) مانا گیا۔ کلام الٰہی نے بھی من اول یوم❶ کالفظ استعمال کرکے صحابۂ کرام کے اس تخیل کی تائید فرمائی۔

آج ہرطرف پس ماندہ قوموں کو ترقی دینے کا شور ہے۔ لیکن جب ان کی ہمدردی کے دعویدار سیاسی رہنما مساوات اور سوشلزم کانام لے کر کہتے ہیں "معیار زندگی بلند کرو" تو مسجد مبارک اور تعیر حجرات کا سادہ نقشہ خاموشی سے اشارہ کرتا ہے کہ قوم کی تعمیر ایسے نعرہ سے نہیں ہوسکتی بلکہ اس طرح کے عمل سے ہوتی ہے ۔ ہمدردی یہ نہیں کہ آپ اپنی کوٹھی کی سب سے اونچی منزل پر رونق افروز ہوکر خاک نشین غریبوں کو حکم دیدیں کہ ایسی ہی کوٹھی تم بھی بناؤ تاکہ مساوات اور برابری رونما ہو ۔ اس کو ہمدردی نہیں کہاجاسکتا یہ ستم ظریفی ہے۔ اس نعرہ سے آپ اپنے کردار کو مشتبہ کردیتے ہیں کہ آپ اس نمائشی نعرہ سے غریبوں کو سبز باغ دکھاکر اپنی عیش پرستی کے لئے وجہ جواز ❷ نکالتے ہیں ۔

ہمدردی یہ ہے کہ آپ قصرمعلیٰ کی سطح بالا سے نیچے اتریں ، غریبوں کی ٹوٹی چٹائی پر ان کے برابر بیٹھیں ، پھر ان کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں۔ یعنی پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بلند کرنے کے بجائے آپ معیار زندگی کو برابر کریں ۔ سیرتِ

---

❶ لَّمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ (سورہ توبہ)

❷ یعنی جب معیار زندگی بلند کرنا نصب العین قرار دیاگیا تو جس کا معیار بلند ہوگیا ہے وہ قابل اعتراض نہیں ۔ گویا وہ منزل پر پہلے پہنچ گیا ہے۔

مبارک کا ایک روشن باب یہ ہے کہ آپ نے اقتصادی تعمیر و ترقی کیلئے یہی اسلوب اختیار فرمایا۔ چندمثالیں ملاحظہ فرمائیے :

(۱) ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ٹٹیوں کا تھا۔ ٹٹیوں میں سوراخ ہوگئے تھے جب آنحضرت ﷺ غزوہ دومۃ الجندل میں تشریف لے گئے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس غیبوبت میں حجرہ کی دیواریں کچی اینٹوں کی بنوالیں۔ آنحضرت ﷺ غزوہ سے واپس ہوئے تو سب سے پہلے انہیں کے یہاں تشریف لے گئے۔۔ دریافت کیا : یہ تعمیر کیسی ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے معذرت کی کہ دیوار اس لئے بنوالی ہے کہ پردہ ہوجائے کسی کی نظر نہ پڑسکے فرمایا: مال کا بدترین [3]مصرف یہ تعمیر[4] ہے ۔

حاصل یہ ہے کہ آپ نے (ﷺ) عذرقبول فرمایا : مگر اس عمل کی تائید اور حمایت نہیں فرمائی جس سے ایک امتیاز پیدا ہورہا تھا ۔

(۲) اسی دور کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک راستہ کے کنارہ پرایک مکان دیکھا جو حال میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا پھاٹک شاندار بنایاگیا تھا اور پھاٹک پر قبہ نما محراب بھی رکھی گئی تھی ۔ دریافت فرمایا : یہ مکان کس کا ہے؟ ایک انصاری کانام بتایاگیا ۔

---

[3] یعنی کرایہ کے لئے مکانات بنوانا بھی ایک قسم کی زمینداری ہے جو پسند نہیں ہے (واللہ اعلم بالصواب)

[4] طبقات ابن سعد ۱۸۱ ج ۲ (الجزءالاول من القسم الثانی)

آنحضـــرتﷺ خـــاموش ہوگـــئے ۔ اگلے روز یہ
انصـاری دربـار رسـالت میں حاضـر ہوئے تـو
خلاف معمـول آقـا دوجہاںﷺ کـا رخ پلٹـا ہوا
پایا ۔ حاضرین مجلس سے اس بے التفاقی کی
وجہ معلوم کی تو کوئی خاص سبب کسی کـو
بھی معلوم نہیں تھـا ۔ البتہ کـل کے واقعہ کـا
تـــذکرہ کیاگیـــا کہ جب حضـــرت والا ﷺ آپ کے
مکـان کی طـرف سـے گـذرے تھے تـو قبہ دار
پھاٹـک کـو دیکھ کـر دیـافت فرمایـا تھـا کہ یہ
پھاٹـک کس کـا ہے ؟ انصـاری جـاں نثـار نے یہ
بـات سـنی ، واپس مکـان پـر پہنچے اور پـورے
پھاٹـــک کـــو منہدم❶ کراکـــر زمین کے برابـــر
کردیا ہے❷

(۳) یمن کا ایک قبیلہ بنواشعر تھا۔ اس قـبیلہ
کے جو خانـدان مسـلمان ہوگـئے تھے وہ مـدینہ
میں رہتے تھے اورفـوجی خـدمات (جہاد) میں
حصہ لیا کرتے تھے ۔ ہر ایک خاندان اپنے آمـد و
خرچ کا خـود ذمہ دار تھـا۔ لیکن ان کـا یہ بھی
دستور تھاکہ اگر کسـی کی آمـدنی میں کمی
ہوجاتی (مثلا موسم کے ختم پر نئی فصل سے

---

❶ اخلاص کی انتہا یہ ہے کہ منہدم کردینے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ کچھ دنوں بعد جب دوبارہ اس طرف سے آنحضرت ﷺ کا گزر ہوا تو خود آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس پھاٹک کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تب آپ نے فرمایا اما ان کل بناءوبال علی صاحبہ الامالا الامالا الامالا ہر ایک تعمیر اس کے بانی کے حق میں وبال ہے مگر وہ جو ضروری ہو بہت ضروری ہو جس کے بغیر چارہ نہ ہو

❷ ابوداؤد شریف باب فی البناءص ۳۶۴ ج ۲ مجتبائی

پہلے تنگی ہوجاتی یا سفر میں کسی کا توشہ ختم ہوجاتا) تو ایسا کرتے تھے کہ تمام خاندانوں میں جس کے یہاں جو غلہ یا توشہ ہوتا وہ سب ایک جگہ اکٹھا کرلیتے تھے پھر سب کو برابر تقسیم کردیتے۔ یہ آپس کی ہمدردی اور باہمی اتفاق کی صورت آنحضرت ﷺ کو اتنی پسند تھی کہ مجمع میں اس کی تعریف فرماتے ہوئے یہاں تک فرماتے :

هم منی وانا منهم (وہ میرے ہیں میں ان کا)

(بخاری شریف ص ۳۳۸)

(۴) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں ۔ آنحضرت ﷺ کو ان سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا ۔ جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں ان سے رخصت ہوتے۔ اور جب سفر سے واپس ہوجاتے تو سب سے پہلے ان کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس ہوئے اور حسب معمول ان کے یہاں تشریف لے گئے مگر حجرے (کمرے) کے اندر نہیں داخل ہوئے، دروازے سے ہی واپس تشریف لے آئے ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس مرتبہ نئی بات یہ کی تھی کہ حجرے کے دروازے پر کپڑے کا پردہ آراستہ کردیا تھا ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے ۔ واپس ہوئے تو حضرت فاطمہ غمگین بیٹھی تھیں جب انہیں معلوم ہوا کہ غمگین اس لئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تھے اور خلاف معمول باہر سے

ہی واپس ہوگئے تو خدمت مبارک میں حاضر ہوکر کبیدگی کا سبب دریافت کیا ۔ ارشاد ہوا : ”دروازے پر کپڑے کا پردہ سجارکھا ہے مجھے ایسے تکلفات سے کیا واسطہ ؟“

اب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراضگی کا سبب معلوم ہوا تو معافی چاہی اور عرض کیا جو حکم ہو اس کی تعمیل کروں ۔

آنحضرت ﷺ نے ایک غریب عیالدار کا نام لیا اور فرمایا کہ یہ کپڑا ان کے یہاں پہنچادو۔[1]

(۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت اسماءبنت یزید رضی اللہ عنہ وغیرھما کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو سونے کے زیورات سے منع کیا ، یہاں تک فرمادیا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کو آگ کا کنگن پہنائے وہ اس کو سونے کا کنگن پہنادے ۔[2]

(علماءکا اتفاق ہے کہ یہ ممانعت ابتداءمیں تھی اس کے بعد عورتوں کو سونے کے زیورات کی اجازت دی گئی ، البتہ یہ ضروری قرار دیاگیا کہ ہرسال ان کی زکوٰۃ بلاناغہ پوری پوری ادا ہوتی رہے)

سلسلہ مواخات اور سیاسی رہنماؤں کیلئے ایک سبق

---

[1] ابوداؤد شریف باب فی اتخاذ الستور

[2] ابوداؤد شریف باب ماجاءفی الذہب النساءص ۲۳۰ ج ۲ مجتبائی

وَيُزَكِّيهِمْ ❸ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران آیت ۱۶۴)

آنحضرت ﷺ مدینہ میں قیام فرماہوئے تو آپ کی حیثیت سیاسی سربراہ (امیر) کی بھی تھی۔ آپ مہاجر ین کی آبادکاری کیلئے کوئی قانون بناسکتے تھے ، مگر سیرۃ مبارکہ کاسبق یہ ہے کہ قانون بنانا کارگر نہیں ، دلوں کو بنانا چاہئے ۔ سیاسی یا اقتصادی انقلاب کے بجائے دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کرو ۔

آنحضرت ﷺ کا ایک بہت مشہور ارشاد❹ ہے جس کا مفہوم یہ ہے :

”جسم انسان میں ایک پارچہ گوشت ہے اگر وہ ٹھیک ہے تو بدن کی پوری عمارت آباد ، اگروہ خراب ہے تو بدن کی پوری عمارت ویران ۔ یاد رکھو وہ قلب ہے ۔“

کلام اللہ شریف نے آنحضرت ﷺ کی شان یہ بیان فرمائی تھی:

> **”تمہارا (اہل ایمان کا) رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق (سخت ناگوار) گذرتا ہے ، تمہاری بھلائی کا حریص (بہت خواہشمند) ہے وہ مومنوں کے لئے شفقت رکھنے والا رحمت والا ہے ۔❺ وہ ان کو (اہل ایمان کو) اللہ کی آیتیں سناتا ہے**

---

❸ **ان کو (اہل ایمان کو) پاک صاف کرتے ہیں (سنوارتے ہیں) اور ان کو کتاب اور حکمت (دانش و بینش) کی تعلیم دیتے ہیں ۔ سورہ ۳، آیت ۱۶۳**

❹ **بخاری شریف وغیرہ صحاح**

❺ **سورہ ۹ توبہ آیت ۱۲۸**

اور ان کو سنوارتا ہے (ہرطرح کی
برائیوں سے انہیں پاک کرتا ہے)”❷

قانون کے سامنے چاروناچارگردنیں جھک جاتی ہیں مگر دل نہیں سنورتے۔ یہ نبی رحمت، رؤف رحیم کی نظرکیمیا اثر کی برکت تھی کہ حضرات انصار کے دل ایسے سنوارے، بخل اور حب مال کی برائی ختم ہوکر ایثار ، فدائیت اور سخاوت کے وہ بے پناہ جذبات ان میں موجزن ہوئے کہ جیسے ہی رشتہ اخوت قائم ہوا انہوں نے خود درخواست پیش کردی ۔

اقسم بیننا وبین اخواننا النخیل❸

ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم کردیجئے ۔“

حضرات انصار کا اصرار یہ تھا کہ حضرات مہاجرین کو ان جائیدادوں کا مالک بنادیا جائے لیکن رحمتہ اللعالمینﷺ جیسے غریب اور پردیسی مہاجرین کے حق میں مشفق و محسن تھے، اسی طرح آپ کا دامن رحمت انصار پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ ان کے حق میںبھی آپ رؤف رحیم تھے۔ آپ نے ملکیت کی تقسیم منظور نہیں فرمائی صرف پیداوار کی تقسیم کا فیصلہ فرمایا تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ (یہ ہونی چاہیے شان سیاسی سربراہ اور رہنماءقوم کی)

---

❷ سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۶۴
❸ بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

سیرت مبارکہ کے اشارات
اور
تحریکات دورحاضر کے نظریات
میں بنیادی فرق

وَبِضِدِّهَاتَتَبَیَّنُ الْاَشْیَاء

سیرت مبارکہ کے پرتقدس سلسلے میں سوشلزم کمیونزم وغیرہ دور حاضر کی تحریکات کا ذکر کرنا سوءادب اور گستاخی ہے ۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بِضِدِّهَاتَتَبَیَّنُ الْاَشْیَاء (یعنی کسی حقیقت کی پوری وضاحت جب ہوتی ہے جب اس کی مقابل اور برعکس چیز کو سامنے رکھا جائے)

نور آفتاب کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب ظلمت شب کی مصیبت جھیلی ہو۔ لہذا ان تحریکات کے بنیادی نظریات کا کسی قدر تذکرہ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیرت مبارکہ کے ان اشارات کی وضاحت ہوسکے جن کا تعلق اقتصادیات سے ہے اور انصاف پسند اہل بصیرت ان کی قدرو منزلت معلوم کرسکیں ۔ اس کے

علاوہ واقعہ یہ ہے کہ تحریکات حاضرہ کے متوالوں میں ایسے بھی ہیں جو ان تحریکات کا پیوند دامن اسلام سے جوڑنا چاہتے ہیں اور اس کو اسلام پر ایک احسان سمجھتے ہیں۔ لہذا بنیادی فرق کی وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایسے محسنین اسلام کے سامنے حقیقت جلوہ گر ہوسکے ۔

(۱)

سب سے پہلا فرق یہ ہے کہ ان تحریکات کے بانیوں نے اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کا سمجھنا سب سے پہلے ضروری تھا ۔

ان تحریکات کا منشاءاگر انسانی سماج کی فلاح و بہبود ہے تو سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ انسان کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ انسان کیا ہے ، انسانیت کیا ہے ، تاکہ انسان کی فلاح و بہبود کے معنیٰ اور ترقی کا معیار معین ہوسکے ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ تحریکات دور حاضر کی پیداوار ہیں اور اس سے پہلے انسان کے دماغ پر تالے پڑے ہوئے تھے ۔ ان تالوں کی کنجیاں بیسویں صدی عیسوی میں انسان کے ہاتھ آئی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف ڈیزائن اور نقشہ بدلا ہے ورنہ ان تحریکات کی بنیادیں بہت قدیم ہیں اور اس طرح کے انقلاب سے دنیا ہمیشہ دوچار ہوتی رہی ہے ۔[1]

---

[1] فارسی زبان اور تاریخ ایران سے دلچسپی رکھنے والے مزدوک سے واقف ہیں جس نے تقریباً پانچویں صدی

موجودہ تحریکات اور ان کی ہم جنس سابق تحریکات کی مشترکہ کوتاہی یہ ہے کہ ان کی بنیاد صرف خدا فراموشی پر نہیں ہے بلکہ خود فراموشی بھی ان کی بنیادوں کا کنکریٹ اور اینٹ گارا ہے۔

انسان کیا ہے ، کیوں پیدا ہوا ، اس کا مستقبل کیا ہے ؟ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے ؟ موت کی حقیقت کیا ہے ؟ وہ فنا ہے یا انتقال (یعنی حالت کی تبدیلی اور ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوجانا)

اگر موت انتقال ہے اور انسان موت کے بعد بھی باقی رہنے والی حقیقت ہے تو مابعد الموت کا تعلق موجودہ زندگی سے کیا ہے ؟۔ قول و عمل اگر باقی رہنے والی حقیقتیں ہیں تو کس طرح ؟ اور ان کا کچھ اثر مابعدالموت ہوگا یا نہیں ؟ عاقبت اندیش انسان کا فرض ہے کہ میدان عمل میں قدم رکھنے سے پہلے ان سوالات کو حل کرلے ۔ ان سوالات سے غفلت خود فراموشی ہے جس کا نتیجہ خدا فراموشی ہوتا ہے ۔ من لم یعرف نفسہ لم یعرف ربہ ۔

انسان ایک جاندار ہے ۔ جو اپنے اندر غور وفکر اور تحقیق وتنقید کی طاقت رکھتا ہے ۔ جس

عیسوی میں تحریک چلائی تھی کہ زر، زن اور زمین سب کے لئے مشترک ہے ۔ زنان ر اخلاص گردانید واموال رامباح داشت وہمہ مردمان رادرخواستہ زن شریک ساخت چنانکہ در آتش وآب وعلف انباز ند(دبستان مذہب) والملل ونحل ص ۸۶ ج ۲، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کی تصنیف "اقتصادی تحریکات اور اسلامی تعلیم کے اشارات"

کی بنا پر اس نے خاص طرح کی زندگی اختیار کی۔ جس نے درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے موجودہ تمدن کی صورت اختیار کرلی ۔ جس کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ وہ ہے جس کو سائنس اور فلسفہ کہاجاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ کائنات کی آخری سرحد تک پرواز کرنے کی کوشش کررہا ہے ۔ اس کو کچھ ایسے ضابطوں اور قوانین کی ضرورت ہے جو اس زندگی کو محفوظ رکھ سکیں ۔ اور اس کو خوشگوار بناسکیں ۔ چنانچہ وہ یہ ضابطے بناتا ہے اور ان کو رائج کرتا ہے ۔

یہ ہیں وہ انکشافات جو تحریکات کے بانی صاحبان کو حقیقت انسان کے متعلق خودبخود یا اس سائنس اور فلسفہ کے ذریعہ سے ہوگئے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہرچیز کی حقیقت سے واقف ہے ۔ لیکن اس کائنات میں انسان کی حیثیت کیاہے اس کا جواب سائنس اور فلسفہ نے بھی نہیں دیا ۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کے شروع ہی میں چند تمہیدی فقروں کے بعد سب سے پہلے انسان کی وہ خصوصیت بیان کی گئی ہے جو اس کو باقی تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے ۔ ساتھ ساتھ اس کی وہ حیثیت واضح کی گئی ہے جو اس کو پوری کائنات یعنی عالم مخلوقات میں حاصل ہے۔

(۳)

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ جملہ مذاہب اس پر متفق ہیں کہ

(۱) انسان کا خاتمہ موت پر نہیں ہوجاتا بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے ۔ موت کی حقیقت فناہوجانا نہیں ہے بلکہ موت ایک تبدیلی اور انتقال ہے یعنی عالم مشاہدہ سے ایک ایسے عالم کی طرف منتقل ہوجانا جو ہمارے مشاہدہ سے بالا ہے ۔

(۲) اور یہ کہ انسان کا حقیقی اور دائمی مستقبل وہ ہے جس کا آغاز اس انتقال اور اس تبدیلی کے بعد ہوگا جس کو موت کہاجاتا ہے ۔

لیکن اگر حقیقی مستقبل اور حقیقی زندگی وہ ہے جو موت کی گھاٹی کو پار کرنے کے بعد سامنے آئے گی تو موجودہ زندگی کا تعلق اس سے کیا ہوگا ؟ اس زندگی کا آغاز ازسرنو ہوگا یعنی نیست سے ہست اور عدم کی جگہ ایک وجود کا آغاز ہوگا یا وہ زندگی موجودہ زندگی کا نتیجہ اور ثمرہ ہوئی؟ گویا آج ہم بور ہے ہیں اور مرنے کے بعد اس کو کاٹیں گے یا وہ ایک قدرتی ارتقا ہوگا؟ یعنی جس طرح انسان کا موجودہ وجود ایک ارتقائی [0]درجہ ہے جو تخلیق کے بہت سے

---

[0] ڈارون کا نظریہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے ۔ ہمارے پیش نظرقرآنی آیات ہیں جن میں یہ ترتیب قائم کی گئی ہے کہ انسان کی سرشت مٹی سے ہوئی ۔ پھر ہرانسان کے مراتب تولید میں نطفہ ، پھر حلقہ (خون بستہ) پھر گوشت کا لوتھڑا پھر انسانی شکل ، پھر نفخ روح ، پھر ولادت ، پھر بچپن ، جوانی ، کہولت ، پھر بڑھاپا ، بس جس طرح نفخ روح (جان پڑجانے کے بعد) بطن مادر میں رہا اور وہاں سے اس عالم میں آیا ۔ یہ بھی ایک انتقال ہے ۔ اسی طرح موجودہ عالم بطن گیتی ہے جہاں وہ اپنے اوصاف وخصائل اور اپنے کردار عمل کے ساتھ نشوونما

مراحل طے کرنے کے بعد ظہور پذیرہوا ہے۔ ایسے ہی مابعدالموت بھی ایک ارتقائی درجہ ہوگا ۔ سائنس نے اس کا جواب نہیں دیا ۔ مذہب اس کا جواب دیتا ہے اور قرآن حکیم اس جواب کو سامنے رکھ کر نہ صرف اقتصادیات وسیاسیات بلکہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ضابطہ حیات مقرر کرتا ہے ۔ آنحضرتﷺ کی سیرۃ مبارکہ جو قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے اس کی عکاسی کرتی ہے ۔

(۴)

خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اس کو مانے۔ انسان کو ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو باہوش ثابت کرنے کے لئے خدا کو مانے۔ اس شخص کو باہوش نہیں کہاجاسکتا جس کا دعویٰ یہ ہوکہ تاج محل خودبخود وجود میں آگیا ۔

یہ شخص اگر اسی کورباطنی کے ساتھ تاج محل کی سیرکرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ بانی اور معماروں کی قدر نہیں کرے گا ۔ بلکہ یہ کہ وہ سنگ تراشی، نقش سازی ، ڈیزائن سازی اور انجینئرنگ وغیرہ کے تصورات سے بھی محروم رہے گا ۔ اس کے ذہن میں بھی نہیں آئے گا کہ ڈیزائن سازی بھی کوئی خاص فن ہے۔ سنگ خار

پارہا ہے اور مرنے کے معنیٰ کہ وہ بطن گیتی سے دوسرے عالم میں منتقل ہوگا اور جس طرح ماں باپ کی خصلتیں اور ان کے امراض عموماً بچہ میں سرایت کرجاتے ہیں انسان کے اعمال و کردار کے اچھے برے اثرات بھی انسان میں اثر کرجائیں گے ۔ دوسرے عالم میں ان کے اثرات ظاہر ہونگے ۔

اور سنگ مرمر پر پھول اور بوٹیاں بنانا پھر ان میں رنگ بھرنا اور ایسے مسالے تیار کرنا کہ صدہاسال کی سیکڑوں برساتیں ان پر کوئی اثر نہ کرسکیں۔ عمارت کے طول وعرض ، بلندی وغیرہ کو موزوں رکھنا بھی قابل قدرہنر ہیں ۔

یہ ظالم تاج محل کو خودرو مان کر ان تمام فنون اور ان کے ماہرین پر ظلم کرتا ہے۔ ان فنون کے ایجاد کرنے اور ترقی دینے کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں آتا ۔ وہ خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور اپنی ظالمانہ فطرت سے ان تمام فنون کو بھی مجروح اور مفلوج کردیتا ہے۔ ایسے کو رباطنوں کو اگر اقتدار کی باگ ڈور دیدی جائے تو کیا تمدن ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گا۔

کائنات کے اس تاج محل میں جو حسن اور خوبیاں ہیں ان کو صحیح طور پر وہی پہچان سکتا ہے جو اس کے پیدا کرنے والے کو پہچانے۔ اسی کو معرفت حق کہاجاتا ہے۔ معرفت حق حقیقت پسندی اور خدا پرستی کی بنیاد ہے ۔ اس کو مضبوط کرنے اور ترقی دینے کانام روحانیت ہے ۔

(۵)

انسان کی حیثیت:

انسان کی حیثیت اگر یہ ہے کہ وہ ایک جاندار ہے جس کو عقل کی نعمت دے دی گئی ہے۔ تو اس سے اعلیٰ اخلاق ، شرافت اور روحانیت کا مطالبہ خاص وزن نہیں رکھتا ۔ اگر وزن رکھتا

ہے تو صرف اتنا جو بتقاضاءعقل ضروری ہو ۔ مگر اسلام نے انسان کی حیثیت بہت بلند قرار دی ہے ۔ وہ کمالات تخلیق کا بہترین نمونہ[1] اور نظام قدرت کا شاہکار ہے جس کو یہ عزت اور عظمت[2] دی گئی ہے کہ وہ اس پوری کائنات میں خالق کائنات کا خلیفہ[3] ہے ۔ کائنات کی بڑی سے بڑی مخلوق حتیٰ کہ چاند سورج اور زمین وآسمان کو بھی خالق و قادر ذوالجلال نے اس کے لئے مسخر[4] کردیا ہے۔ وہ ہر ایک پر حکم چلاسکتا ہے جس کو چاہے اپنے کام میں لاسکتا ہے ۔

یہ ہے انسان کی حیثیت اسلام کی نظر میں اور خود فراموشی یہ ہے کہ انسان اپنی اس حیثیت سے اور اس حیثیت کے بموجب جو اس کے فرائض ہیں ان سے غافل ہو ۔

فرائض :

خلافت ونیا بت کے منصب جلیل کا جس طرح یہ تقاضا ہے کہ خلیفہ اپنے آقا کا فرمانبردار اور وفادار ہو ۔ ایسے ہی اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آقا کے کمالات کا مظہر ہو ۔ اور ان نقائص سے پاک ہو جو کمالات کی ضد ہیں اور عیب سمجھے

---

[1] لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (سورہ والتین،۴)

[2] وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (سورہ بنی اسرائیل ، ۷۰)

[3] اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (سورہ بقرہ آیت ۳۰)

[4] وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ (سورہ ابراہیم ،۳۳) وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (سورہ جاثیہ آیت ۱۲)

جاتے ہیں ۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے فقروں میں خالق کائنات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے ۔

۱۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بہت رحم کرنے ولا بہت مہربان

۲۔ رَبِّ الْعٰلَمِینَ تمام جہانوں کا پالنے والا

۳۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ مالک انصاف کے دن کا

(۱) سب سے پہلے ضروری ہے کہ انسان میں رحم ہو، شفقت اور مہربانی ہو ۔

(۲) اس کی فطرت میں تربیت ہو (یعنی پرورش کرنا ، سکھانا ، سدھانا ، ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری کرنا) سخاوت، بخشش اور سیرچشمی جیسے صفات سے وہ آراستہ ہو ۔

رب العٰالمین خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے۔ وہ بھوک پیاس سے بھی بے نیاز ہے لیکن انسان (جو کھانے پینے کا محتاج ہے) اگر بھوکوں کی ضرورت کو اپنی بھوک سے مقدم رکھے تو اس کا نام ایثار اور قربانی ہے ۔

(۳) رَبِّ الْعٰلَمِینَ سب سے بڑا منصف ہے اس کے خلیفہ کو بھی عدل و انصاف کا پیکر ہونا چاہئے ۔

(۴) خالق کائنات رَبِّ الْعٰلَمِینَ ، عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ[۱] ہے یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ

---

[۱] ان تمام باتوں کا جاننے والا جو پردۂ آسمان میں یا سینۂ زمین میں چھپی ہوئی ہیں ۔ (الفاطر۔۳۸)

وَالْبَحْرِ❷ ہے اس کی صفت ہے اس کے خلیفہ اور نائب کو بھی ذی علم ہونا چاہئے وہ عٰلِمُ غَيۡبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اور عٰلِمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ نہیں ہوسکتا، مگر اس کا فرض ہے کہ اپنے علم کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے اور دعا کرتا رہے ۔ رَّبِّ زِدْنِیۡ عِلْمًا❸

(۵) رَبِّ الْعٰلَمِينَ صرف خالق ہی نہیں بلکہ اس کی صفت ہے : بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرْضِ❹ نئی طرح بنانے والا (ایجاد کرنے والا) زمینوں اور آسمانوں کا ۔

فکر انسان کو بھی چاہئے کہ تخلیق وایجاد کی باریکیوں کی تلاش کرنے میں مصروف رہے ۔ وہ نیست کو ہست اور معدوم کو موجود تو نہیں کرسکتا ۔ یہ تو وہی کرسکتا ہے جس کے ایک حکم "کن" پر نیست ہست بن جائے❺ اور عدم محض جامہ وجود سے آراستہ ہوجائے البتہ وہ یہ ضرور کرسکتا ہے کہ موجودات کی پوشیدہ صلاحیتوں کا کھوج لگائے اور مخفی طاقتوں کے اسباب وذرائع معلوم کرکے جدید ایجادات کو بروئے کار لائے ۔

مختصر یہ کہ یہ اوصاف کمال کا سلسلہ تھا ان کے برعکس اوصاف نقص ہیں ۔ رحم ،

---

❷ ان تما م باتوں اور ان تمام طاقتوں کو جانتا ہے جو سمندر یا خشکی میں ودیعت ہیں ۔ (الانعام ۵۹)

❸ سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۴

❹ سورہ الانعام آیت ۱۰۱

❺ ہوجائے یعنی عالم کون وہست میں آجائے عالم وجود میں آجا ۔

مہربانی اور شفقت کے مقابلہ میں سخت مزاجی ، سنگ دلی ، جبروقہر ، سخاوت اور سیرچشمی کے مقابلہ میں بخل ، تنگ دلی اور کنجوسی ، حاجت روائی اور کارسازی کے مقابلہ میں خود غرضی اور نفع اندوزی، ایثار کے مقابلہ میں ، حرص طمع ، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی ، عدل وانصاف کے مقابلہ میں ظلم، علم کے مقابلہ میں جہل وسفاہت، تحقیق و تنقید کے مقابلہ میں اندھی تقلید ۔

انسان میں قدرت نے دونوں صلاحیتیں رکھی ہیں، وہ اوصاف وکمال کو اپنا کر کامل و مکمل بھی بن سکتا ہے اور اوصاف نقص کو اختیار کرکے ، ذلیل ، کمینہ اور شیطان اخرس بھی بن سکتا ہے۔ شریعت[❷] کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اوصاف نقص سے پاک ہوکر اوصاف کمال اختیار کرے، اسی کو تقدس کہاجاتا ہے ۔ اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش تزکیہ ہے جو آنحضرتﷺ کی بعثت کا اہم مقصد اور آپ کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے ۔

کہاجاتا ہے کہ دور حاضر کی تحریکات کا مقصد یہ ہے کہ ملک کا ہرایک باشندہ خوشحال ہو، زندگی کی ضرورتیں اس کو میسر ہوں ، باشندگان ملک اطمینان کی زندگی گزارسکیں، یہ مقصد بہت مبارک ہے لیکن جب تک انسان بری خصلتوں سے پاک نہ ہو کیا یہ مقصد حاصل

---

❷ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۚ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔ (سورہ الاحزاب ۔ ۷۲)

ہوسکتا ہے؟ یہ دوسرا فرق ہے جو سیرت مبارکہ کی تعلیمات کو موجودہ تحریکات سے ممتاز کرتا ہے کہ سوشلزم و نیشنلزم وغیرہ کا اسکول تزکیہ اور اصلاح اخلاق کے مفہوم سے ناآشنا بلکہ اس کے ماحول میں یہ الفاظ قطعاً بے جوڑ اورمضحکہ انگیز ہیں جبکہ سیرة مبارکہ کی تعلیمات تزکیہ کو ایسا محور قرار دیتی ہیں کہ ہر ایک نظام اسی کے گرد گھومتا ہے اور اسی کی درگاہ سے سند جواز حاصل کرتا ہے ۔ کوئی بھی نظام ہو اگر اس کی بنیاد تزکیہ پر نہیں ہے تو باطل اور فاسد ہے، کیونکہ سیرت مبارکہ کی تعلیمات کا مطمح نظرصرف حیوانی زندگی نہیں جو چند روزہ عارضی ہے بلکہ اس کا مطمع نظر وہ حقیقی زندگی ہے جو ابدی اور دائمی ہوگی جس کی خوش گواری تزکیہ پر موقوف ہے ۔

(۶)

ٹیکس کی عربی ضربیہ ہے ۔ آپ پورے قرآن شریف کا مطالعہ کرلیجئے آپ کو کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملے گا جو مالی نظام کے سلسلہ میں ٹیکس اور ضربیہ کے مفہوم کو ادا کرتا ہو کیونکہ ٹیکس کی تہ میں جبراور قہر ہوتا ہے ۔ قانون کے بنانے والے اگرچہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں مگر اس کے نفاذ کی پشت پر حکومت کی مسلح طاقت ہوتی ہے ۔ اس طرح استحصال تو ہوسکتا ہے کہ حکومت کو رقم مل جائے اور اس کے بجٹ کا خسارہ پورا ہوجائے مگر ادا کرنے والوں کے اخلاق کی اصلاح اور دلوں کا تزکیہ

نہیں ہوسکتا ۔ بخل ، طمع ، حرص جیسے امراض بدستور رہتے ہیں اور آرڈی ننس یا قانون کی بھیانک طاقت ان امراض میں نفرت ، غصہ ، بغض اور عداوت جیسی بیماریوں کا اضافہ کردیتی ہے ۔

جاگیرداری نظام ، سرمایہ داری ، زمیندارہ ، انتہایہ کہ فرد کی ملکیت ختم کردی جائے تو بہت سے محشر تو برپا ہوسکتے ہیں مگر دلوں کی پاکی اور اخلاق کی اصلاح نہیں ہوسکتی ۔ بلکہ خاتمہ ملکیت سے عائلی نظام[1] درہم برہم ہوجاتا ہے جس کا نتیجہ[2] وہ نفرت انگیز انار کی ہوتا ہے جو دامن عصمت و عفت کے بھی تار پود بکھیردیتا ہے ۔

جس مالی نظام کی قرآن حکیم رہنمائی کرتا ہے اس کا نتیجہ اگرچہ یہ ہوسکتا ہے کہ سرمایہ داری، جاگیرداری حتیٰ کہ ملکیت بھی ختم

---

[1] صاحب خانہ کا اثر اور دباؤ نہ رہے تو ظاہر ہے گھر کا نظام درہم برہم اور اثر اور دباؤ صرف اس بنا پر نہیں کہ بیوی کا شوہر یا بچوں کا باپ ہے بلکہ دباؤ اور اثر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مالک وقابض ہے۔ بے دست و پاصاحب خانہ کا اثر صرف اخلاقی مطالبہ ہوتا ہے اور جب باپ کا دباؤ نہ ہوتو کیا اولاد بااخلاق بن سکتی ہے ؟

[2] خانگی نظام ختم ہونے کے بعد جب سرکاری پرورش گاہوں میں بچے پرورش پائیں گے تو ایک طرف قرابت اور رشتہ داری کے جملہ حقوق ختم بلکہ رشتہ داروں کو پہچاننا مشکل بھی ہوگا اور بے کار بھی، دوسری جانب جنسی تعلقات کے لئے سلسلہ ازدواج بے معنیٰ ہوجائے گا ۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمایئے احقر کی تصنیف "دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل" "اور اسلامی تعلیم کے اشارات"

ہوجائے[3]، مگر یہ خاتمہ اس طرح ہوگا کہ دلوں کی دنیا بھی بدل جائےگی ۔

خارجی طاقت یعنی آرڈیننس یا قانون کی شورا شوری ہ اہل ثروت اور ارباب دولت کو سراسیمہ اور پریشان نہیں کرے گی بلکہ خود اپنے اندرونی جذبات کی سوزش ان کی نظر میں اس دولت کو وبال جان اور اس کے خرچ کرنے کو راحت واطمینان بنادے گی ۔

مالی نظام کے سلسلے میں جو الفاظ قرآن حکیم یا سنت نبویہ نے استعمال فرمائے ان پر

---

[3] انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو ہرچیز کا اصل مالک اللہ ہے ، بندے کی ملکیت صرف نیابتہ ہے جو مالک حقیقی کی منشا اور اس کی مصلحت کے تحت اور اس کے احکام کے تابع ہوگی ۔ پھر اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے ، اپنے بندوں کا محافظ مشکلات کو حل کرنے والا ، حاجتوں کو پورا کرنے والا (حل المشکلات قاضی الحاجات) پس جب بھی پرورش ، حفاظت ، تعلیم و تربیت وغیرہ کی ضرورتیں پیش آئیں گی، انسان پر بحیثیت نائب و خلیفہ ان ضرورتوں کو پورا کرنا ضروری ہوگا ۔ انفرادی ضرورتیں افراد سے پوری ہوں گی ۔ زکوٰۃ وصدقات اسی لئے ہیں کہ ضرورت مند افراد کی انفرادی ضرورتیں پوری کی جائیں ۔ لہذا ان کی ادائیگی کے لئے حکومت کا توسط ضروری نہیں ہے وہ وہاں بھی لازم نہیں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے ۔ صاحب استطاعت کا فرض ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرے۔ اسی لئے ان میں تملیک بھی ضروری ہے یعنی ضرورت مند کو محض اجازت دے دینا کافی نہیں بلکہ مالک بنانا بھی ضروری ہوتا ہے ۔ البتہ اجتماعی ضرورتیں ہیئت اجتماعیہ یعنی خلافت کے ذریعہ پوری ہوں گی ۔ یہ اجتماعی ہیئت خلافت اِلٰہیَّہ کی حیثیت سے افراد پر اقتدار رکھتی ہے اور افراد کی مملوکات پر بھیے وہ کسی کی ملک چھین نہیں سکتی مگر پابندی لگاسکتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے "دورحاضر کے سیاسی واقتصادی مسائل"

نظر ڈالئے وہ سب انقلاب انگیز ہیں مگر بجٹ کے خسارے کو پورا کرنے کے لئے نہیں بلکہ دلوں کی بیماریوں کو دور کرنے کیلئے ہے۔

سب سے پہلا اور سب سے مشہور لفظ زکوٰۃ ہے جس کے مفہوم میں ،تزکیہ ، داخل ہے۔ زکوٰۃ کے معنیٰ پاکی ہیں اور تزکیہ کے معنیٰ پاک کردینا ۔ یعنی زکوٰۃ اس لئے فرض ہوتی ہے کہ دلوں کو پاک کردے ۔ بخل وہ ناپاکی ہے جو دلوں کو ہی نہیں بلکہ اس ملکیت کو بھی ناپاک کردیتی ہے جو اس کے زیر اثر ہو ۔ زکوٰۃ دل کو بخل سے پاک کرتی ہے تو ساتھ ساتھ دولت کو بھی پاک کردیتی ہے ۔ دوسرا لفظ صدقہ ہے جو صدق سے ماخوذ ہے ۔ یعنی صدقہ اس بات کی عملی دلیل ہے کہ ملی ضرورتوں کے احساس یاغریبوں اور فقیروں کی ہمدردی کا دعویٰ ایک سچی حقیقت ہے ۔ محض نمائش اور بناوٹ نہیں ۔ یہ دو مد لازمی ہیں۔ ان کے مصارف بھی معین ہیں ۔ یہ ضرورت مند افراد کی امداد کے لئے مخصوص ہیں ۔ ان دومدوں کے ذریعہ قوم کی غریبی دور ہوسکتی ہے ۔ ان کے لئے حکومت کا واسطہ بھی ضروری نہیں براہ راست صاحب دولت پر فرض ہے کہ اتنی مقدار اپنی مِلک سے نکالے اور ضرورتمند کی ملکیت میں دیدے۔ مملکت یا ملّت کی اجتماعی ضرورتوں پر زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی ۔ ان ضرورتوں کے لئے قرآن حکیم نے فرض یاانفاق فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال

کیا ہے :

وَ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (سورہ مزمل۔۱۴)

”قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا۔“

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ (سورہ بقرہ آیت ۱۹۵)

”اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور (خرچ کو بند کرکے یعنی بخل کرکے) مت ڈالو اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں“

فرض کیجئے اسلامی مملکت کی مخالف حکومتیں اپنی جنگی طاقتیں زیادہ سے زیادہ مضبوط کررہی ہیں ۔ اسلامی مملکت کی آمدنی کے عام ذرائع دفاعی ضرورتیں نہیں پوری کرسکتے ۔ ہنگامی امداد کی ضرورت ہوتی ہے، حکومتیں ایسی صورتوں میں قومی قرض [1] یا

---

[1] بہت ممکن ہے حکومتوں نے قرض کی اصطلاح بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن سے ہی سیکھی ہو ۔ لیکن اگر یہ اصطلاح قرآن سے سیکھی ہے تو محض الفاظ قرآن کے ہیں روح قطعاً غیرقرآنی ہے۔ قرآن صاحب دولت سے اس تعلق کی بنا پر دولت لیتا ہے جو اس کا خدا کے ساتھ ہے اور حکومتیں سود کا لالچ دیکر قرض لیتی ہیں ۔ قرآن والے قرض سے دولت کی محبت کم ہوتی ہے ، بخل کے مرض میں تخفیف ہوتی ہے اور سرکاری قرض سے ان امراض میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ قرآنی قرض کا بار صرف صاحب دولت پر پڑتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھ کر قرض لیتا ہے کہ اس کا اجر دنیا میں کچھ نہیں ملے گا اللہ کے یہاں ملے گا۔ اور سرکاری قرض کا بارغریبوں پر پڑتا ہے کیونکہ سود کی ادائیگی نئے ٹیکس لگاکر یا ٹیکسوں میں اضافہ کرکے کی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں غریب کی غریبی میں اضافہ ہوتا ہے اور دولتمند اور زیادہ دولتمند ہوجاتا ہے ۔

قرضہ جنگ کی اپیل کرتی ہیں۔ مگر قرآن حکیم یہ قرض اللہ کے لئے طلب کرتا ہے ۔ انفاق یعنی خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ یعنی پہلے انسان کا رشتہ اللہ سے جوڑتا ہے ۔ غیراللہ سے اس کے دل کو پاک کرتا ہے۔ مال و دولت اور ہرچیز کے مقابلے میں اللہ کی محبت بڑھاتا ہے اور ایمان کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ :

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (سورہ بقرہ آیت ۱۶۵)

”جو ایمان لائے وہ بہت بڑھے ہوئے ہیں اللہ کی محبت میں“

اسی محبت کے نتیجے میں وہ اس سے مالی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے ۔ یہ ہے تزکیۂ قلب ۔

(۷)

تزکیہ کس طرح ہوتا ہے:

تزکیہ کا آغاز خود اپنے نفس سے ہوتا ہے۔ پہلے خود اپنی اصلاح کرے، اپنے نفس کو بخل ، طمع ، حب مال جیسی آلودگی سے پاک کرے، تب درجہ بدرجہ دوسروں سے اصلاح قبول کرلینے کی توقع کرسکتا ہے ۔

اس سلسلہ تحریر کا تعلق جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ہے لہذا وہی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن کا تعلق خود ذات اقدس سے ہو (ﷺ) ۔

دولت پرستی اور حب مال سے قلب کو پاک کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے (ﷺ) طے فرمالیا کہ جو کچھ آمد ہو وہ شام تک خرچ کردی جائے ۔ کاشانہ نبوت میں رات کو کوئی ایک

حبّہ بھی باقی نہ رہ سکے ۔

گردنوں کو پھاندکر گزرنا خلاف ادب ہے ۔ آنحضرتﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہاں کسی مجبوری کی صورت میں یہ بے ادبی معاف سمجھی جائے گی ۔ آنحضرتﷺ کو ایک روز خود ایسا کرنا پڑا ۔ آپ عصر کی نماز پڑھارہے تھے کہ آپ کو خیال آیا کہ فلاں زوجہ مطہرہ کے یہاں آپ کی کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے، جیسے ہی آپ نے سلام پھیرا بڑی پھرتی سے آپ کھڑے ہوئے اور ان زوجہ مطہرہ کے یہاں تشریف لے گئے فوراً ہی واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ حیران ہیں کیا ماجرا ہے ؟ خلاف معمول اس طرح تیزی سے کیوں تشریف لے گئے ابھی کوئی دریافت نہیں کرنے پایا تھا کہ آپ نے خود ہی فرمادیا : مجھے نماز پڑھتے ہوئے یاد آیا[1] کہ کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے ، مجھے گوارا نہیں کہ شام کا وقت ہو اور چاندی میرے پاس رہے۔ (ایک روایت میں یہ ہے کہ چاندی میرے گھر میں رات گزارے) لہذا میں کہہ آیا ہوں کہ اس کو تقسیم[2] کردیں ۔ [3]

---

[1] نماز میں کسی بات کا یاد آجانا غیراختیاری ہے اور یہ بھی فطری بات ہے کہ انسان کا ذہن اور دماغ ہروقت کام کرتا رہتا ہے۔ لہذا فطری اور غیر اختیاری پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی ۔ البتہ نماز سے غافل ہوکر خیال میں مصروف اور مشغول نہ ہوجانا چاہئے ۔ اس خیال کو ہٹاکر نماز ہی کی طرف دھیان لگادینا چاہئے ۔ سنت مبارکہ کی تعلیم یہی ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

[2] ضرورت مند اور مستحق لوگوں کی کمی نہیں تھی۔

[3] بخاری شریف ص ۱۶۳ و ص ۱۱۷

یہ احساس لطیف کی نزاکت ہے کہ عصر کا وقت ہے، شام ہونے اور رات آنے میں کافی دیر ہے[4]، مگر یہ دیر بھی دیر نہیں معلوم ہوئی ۔ گویا دولت کی آلودگی سے جس قدر جلد ممکن ہو دامن پاک ہوجائے ۔ یہ تھوڑی سی چاندی کا معاملہ تھا ممکن ہے دو تین تولے ہی ہو مگر دولت کے بڑے سے بڑے انبار کے متعلق بھی آپ کا جذبہ یہی تھا ۔

ایک دن کا واقعہ ہے رات کی چاندنی میں آپ تشریف لے جارہے تھے ۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے ۔ سامنے احد کا پہاڑ تھا، آپ نے فرمایا اگر احد پہاڑ کی برابر سونا میرے پاس ہوتو میری خوشی یہ ہوگی کہ تین راتیں نہ گزرنے پائیں کہ وہ سب راہ خدا میں خرچ ہوجائے، ایک دینار بھی میرے پاس باقی نہ رہے، بجزاس دینار کے جوکسی مطالبہ کو ادا کرنے کے لئے محفوظ رکھنا پڑے ۔[5]

زندگی بھر درہم و دینار کو یہ سعادت میسر نہ ہوئی کہ کاشانہ نبوت میں رات گذارسکے، بعد وفات کے لئے ارشاد ہوا:

لاتقسم ورثتی دیناراً ولادرهماً، ماترکت بعدنفقة

---

[4] سلک احناف کے بموجب گرمیوں میں تقریباً دو گھنٹے اور حضرات شوافع کے مسلک کے بموجب دوسرے مثل ہی میں عصر کی نماز پڑھی گئی تھی تو ابھی تقریباً ایک تہائی دن باقی تھا ۔ مگر الفاظ حدیث (کرهت ان یمسی اویبیت عندنا) بخاری شریف ص ۱۶۳ سے وہی متبادر ہے جس سے مسلک احناف کی تائید ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[5] بخاری شریف ص ۹۵۴ و ص ۳۲۱ وغیرہ

نسائی ومونتہ عاملی فھوصدقة [6]

(یعـنی) یہ تـو ہوگـا ہی نہیں کہ مـیرے وارث دینــار یــا درہم تقســیم کرســکیں ۔ (البتہ کچھ جائیـدادیں مـیری تحویـل میں ہیں۔ تـو) ازواج کے نفقے اور کارنــدے کے حــق المحنت کے علاوہ جــو کچھ میرا ترکہ ہو وہ صدقہ ہے ۔"

استحصال کی بندش :

تزکیہ کا مطلب صرف یہی نہیں رہا کہ اکتناز نہ ہو ۔ یعنی حاصل شدہ درہم و دینـار کـو شـب باشی کـا موقـع نہ ملے (شـام سـے پہلے ہی خـرچ کردیـا جـائے) بلکہ تـزکیہ کـا دوسـرا رخ یہ تھـا کہ آمدنی صـرف وہ ہو جـو ہر طـرح مقـدس ، طیب اور پاک ہو۔ پھر اس پـاک میں بھی یہ پابنـدی کہ زکوٰۃ یا صدقہ نہ ہو ۔ یہ پابندی نہ صرف اپنے لئے بلکہ

(الف) نسلاً بعد نسل اپنی تمام اولاد کے لئے۔

(ب) تمام خاندان کے لئے جـو آل ہاشـم کہلاتـا تھا (انتہایہ کہ)

(ج) اپنے خانـدان کے تمـام آزاد کـردہ [5] غلامـوں کے لئے

پھر لطف یہ کہ (۱) محمد رسول اللہ ﷺ کا تمام

---

[6] بخاری شریف ص ۳۸۹

[5] جن کو مولیٰ کہاجاتا ہے۔ کیونکہ عربوں کـا حوصلہ یہ تھـا کہ وہ اپــنے مــولیٰ کــو بھی اپــنے خانــدان کــا فــرد سمجھاکرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے سوال کـو یہی حیـثیت دی ہے ۔ ارشاد ہے:ان الصدقہ لاتحل لنا وان موالی القــوم من انفسھم ۔ ترمـذی شـریف ص ۸۳ ج ۱،ابـو داؤد شـریف ص ۲۴۰ ج ۱ وھٰکذا فی النسائی ص ۳۶۶ ج ۱

تر ترکہ صدقہ ، آپ کے وارثوں کو یہ حق نہیں کہ اس کو تقسیم کرسکیں ۔ مگر صدقہ یا زکوٰۃ کی یہ مجال نہیں کہ وہ آل ہاشم کا دامن چھوسکے ۔(۲) پوری امت کے لئے یہ ضابطہ کہ

توخذ من اغنیاءھم وتردعلی فقراءھم

یعنی جس قوم یا گروہ کے دولت مندوں سے زکوٰۃ لی جائے وہ اسی گروہ یا قوم کے ضرورتمندوں کو دیدی جائے ۔ مگر آنحضرتﷺ اور آپ کے خاندان کے لئے اس میں یہ ترمیم کہ اس ضابطہ کا جزو اول تو واجب العمل کہ اگر دولت مند ہوں تو عام مسلمانوں کی طرح ان سے بھی زکوٰۃ و صدقہ لیاجائےگا لیکن دوسرا جزو (کہ ان کے ضرورت مندوں کو دیا جائے) حرام۔ یعنی آل ہاشم کے دولت مند یہ نہیں کرسکتے کہ عام دستور کے بموجب وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم یا صدقہ فطر اپنے کسی ہاشمی رشتہ دار یا اس کے آزاد غلام کو دے دیں ۔ یہ رقم لامحالہ کسی غیرہاشمی مسلمان کو ہی دینی ہوگی ۔

صدقہ کے کھجور آئے ہوئے پڑے تھے ۔ جگرگوشہ رسول اللہﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بچے تھے [❷]۔ انہوں نے ایک کھجور منہ میں رکھ لیا ۔ جیسے ہی سرکار دوعالمﷺ کی نظر پڑی لخت جگر کو تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا :

کخ کخ اماشعرت انا لاناکل الصدقہ

”اخ تھو۔ اخ تھو۔ تمہیں اتنی تمیز نہیں کہ

---

❷ پیدائش نصف رمضان سنہ ۳ ھ (تاریخ الخلفا) آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت تقریباً ساڑھے چھ سال عمر تھی ۔

ہم صدقہ❸ نہیں کھایا کرتے ہ“

رازدرون پردہ گداران کی کیفیت:

ان تمام پابندیوں اور احتیاطوں کے بعد اندرون نشیمن کیا حالت رہا کرتی تھی ، ذرا جھانک کر دیکھو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب بھی میں کھانا کھانے بیٹھتی ہوں، طبیعت ایسی بھرآتی ہے کہ اگر چاہوں تو خوب روسکتی ہوں ۔ مجھے وہ حالت یاد آجاتی ہے جو آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں رہی ۔ یہاں تک کہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے ، خدا کی قسم کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ دونوں وقت آپ روٹی اور گوشت سے شکم سیر ہوئے ہوں ۔ ❶

میدے آپ نے عمر بھر نہیں دیکھاے کبھی آپ کے لئے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ جوکا آٹا بھی بے چھنا پکتا تھا، یہی خوراک تھی۔ اس پر بھی دودو ماہ گزرجاتے تھے کہ چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی ۔ دوکالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی غذا ہوا کرتی تھیں، البتہ انصاری پڑوسی دودھ بھیج دیا کرتے تھے۔❷حضرت انس رضی اللہ عنہ (آنحضرت ﷺ کے خادم خاص) فرماتے ہیں: گھر کے❸ آدمی نو تھے، دن رات کے خرچ کیلئے ان سب کے واسطے صرف ایک صاع❹ ہوتا تھا اور ایسا بھی ہوا کہ آپ نے یہودی کے یہاں زرہ رہن رکھ کر جو منگوائے اور

❸ بخاری شریف ص ۲۰۲، و فتح الباری
❶ ترمذی شریف ص ۵۸ ج ۲
❷ بخاری شریف ص ۹۵۶
❸ ازواج مطہرات ، دسویں خود آنحضرت ﷺ

ایسا بھی ہوا میں آنحضرت کے لئے جوکی روٹی اور باسی چربی لے گیا[5] اس کے سوا کچھ نہیں تھا ۔

بچھانے کا گدا چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، [6] اکثر کھرّے چارپائی پر آرام فرماتے تھے ۔ چٹائی کے پٹھے جسم مبارک میں گڑجایاکرتے تھے ۔[7]

وفات ہوئی تو زرہ ایک یہودی کے یہاں[8] تیس صاع جو کے عوض میں رہن تھی۔ [9]

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موٹا کمبل پیوند لگاہوا اور ایک موٹے کپڑے کی لنگی نکال کر ہمیں دکھائی اور فرمایا ان دو کپڑوں میں رسول اللہ ﷺ کی روح قبض ہوئی۔[10]

وفات کے بعد ترکہ یہ تھا : (ضروری) اسلحہ ، ایک خچر ، قطعہ آراضی جس کو صدقہ کردیاتھا۔[1]

ایک معمہ........ :

سنہ ۷ ھ میں خیبر فتح ہوا ، اس کے بعد

---

[4] ایک صاع کا وزن دوسوستر تولہ (تین سو چھ چھٹانگ) تقریباً ۲ کیلوچھ ۶ سوگرام

[5] بخاری شریف ص ۳۴۱

[6] بخاری شریف ص ۹۵۶

[7] بخاری شریف ص ۳۳۵

[8] تیس صاع تقریباًڈھائی من

[9] بخاری شریف ۴۰۹ وشمائل ترمذی شریف

[10] بخاری شریف ص ۸۶۵ ترمذی شریف ص ۲۰۶ ج ۱

[1] بخاری شریف صد ۲۱۳ ،

ازواج مطہرات کے نفقے مقرر کردیئے گئے ۔ ہر ایک خاتون کا سالانہ نفقہ اسی(۸۰) وسق کھجور اور بیس وسق جو[❷] ۔ ایک وسق ۲کا وزن پانچ من ڈھائی سیر ہے اس حساب سے اسی وسق کھجورچارسو پانچ من اوربیس دسق جو ایک سوایک من دس سیرہ کھجور اور جو کا جو بھی نرخ مانا جائے ۔ جب ایک شخص کی خوراک کے لئے مہینے میں ایک من اور سال بھر میں بارہ من جو یا کھجور بہت کافی ہوتے ہیں تو یہ کئی سومن کی مقدار فاضل ہی تھی ۔ اس کے ذریعے زندگی بہت خوش حال بن سکتی تھی پھر یہ تنگی کیوں تھی؟

جواب : کوئی حساب داں اس معمہ کو حل نہیں کرسکتا ۔ قرآن حکیم نے اس کا جواب دیا ہے ۔ جب صحابہ کرام کی شان یہ بیان فرمائی :

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ (سورہ حشر۔۹)

"(ضرورتمندوں کو) اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں باوجود یکہ خود ان کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔"

اور اللہ کے پاک بندوں کی یہ شان بیان فرمائی :

وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا (الدھر۔۸)

"اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر (جب

---

❷ ایک دسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع ۳ سیر چھ چھٹانک (۲۷۰ تولے)

کھانا خود ان کو بھی محبوب ہوتا ہے اور وہ خود بھی ضرورت مند ہوتے ہیں) مسکین کو ، یتیم کو اور قیدی کو ”۔

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر عوام کی اقتصادی حالت معلوم ہوجائے تو معمہ حل ہوجائے گا ۔

عوام کی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آنحضرتﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ کا مع اہل وعیال یومیہ وظیفہ نصف بکری[3] مقرر کیاگیا تھا کیونکہ متوسط درجے کے مہاجر کی یومیہ آمدنی کا اوسط یہی تھا یہ آمدنی فی کس نہیں بلکہ فی گھر تھی ۔

اور جب متوسط درجے کے مہاجرین کی یہ آمدنی تھی تو غریبوں کی آمدنی کا اوسط تو فی گھر اس سے بھی کم ہوگا جس کا لازمی تقاضا عمومی افلاس تھا ۔ پس عمومی افلاس اور عوام کی خستہ حالی اس معمہ کا حل ہے ۔ اسکی وضاحت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ سے ہوتی ہے :

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں جب ازسرنو وظائف مقرر کئے تو ہر ایک زوجہ مطہرہ کا سالانہ وظیفہ دس ہزار درہم مقرر کیا ۔ ام المومنین حضرت زینب بنت حجش (رضی اللہ عنہا) کے یہاں یہ رقم پہلی مرتبہ پہنچی تو فرمایا : اللہ تعالیٰ امیرالمومنین پر

---

[3] تاریخ الخلفاءص ۵۸ مجتبائی بحوالہ طبقات ابن سعد

رحم فرمائے یہ رقم میرے پاس بھیجی حالانکہ میری سہیلیوں میں ایسی ہیں جو مجھ سے زیادہ باہمت ہیں وہ زیادہ مستعدی سے اس رقم کو تقسیم کرسکتی تھیں ۔

جب پیش کرنے والوں نے کہا : محترمہ ! یہ تقسیم کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ توآپ کے جیب خرچ کے لئے ہیں تو فرمایا: اچھا یہاں ڈال دو ۔ ان کو رکھواکر ان پر کپڑا ڈلوادیا ۔ اور اپنی خادمہ سے فرمایا : کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر فلاں خاندان کے لئے رقم نکالو ۔ فلاں خاندان کے لئے نکالو ۔ اسی طرح خاندان شمار کراتی رہیں اور ان کے لئے رقومات علیحدہ کراتی رہیں ۔ خادمہ نے کہا : سیدہ میں بھی تو حاضر ہوں کچھ میرے لئے بھی ، فرمایا : جو کچھ کپڑے کے نیچے رہ گیا ہے وہ تمہارا ہے ۔

خادمہ نے کپڑا اٹھایا توصرف پچاسی درہم باقی تھے ۔ وہ اس کو عطافرمادیئے ۔❶

یہ تھا اسلامی سوشلزم ، اگر اس کو سوشلزم کہاجاسکتا ہے جو تقسیم دولت کا قانون نہیں بنواتا بلکہ دلوں میں دولت سے نفرت اور غریبوں کی ہمدردی کا وہ جذبہ بھردیتا ہے کہ ان کو اطمینان جب ہی ہوتا ہے جب پوری دولت تقسیم ہوجائے اور امیر غریب کی سطح پر آجائے ۔ اسی کو تزکیہ کہاجاتا ہے کہ بخل ، حب مال اور حرص وطمع کے جراثیم سے وہ پارہ گوشت پاک وصاف ہوجائے جس کو دل کہاجاتا ہے

---

❶ کتاب الخراج الامام ابی یوسفؒ ص ۴۵ ۔

نتیجہ :

یہ بحث بظاہر بے محل ہے مگر جب شروع ہوگئی تو اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یہ اقتصادی نظام جس کی بناءمساوات پر رکھی گئی تھی جس کے لئے دولت مند غریب کی سطح پر آجاتے تھے وہ کتنی جلد کامیاب ہوا اور کیسا کامیاب ہوا ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وظیفہ یومیہ نصف بکری معین کیاگیا تھا یعنی پانچ درہم یومیہ ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دوسالہ دور خلافت میں درج رجسٹر مسلمانوں کے وظائف مقرر کئے تو اسی نسبت سے یعنی فی کس پانچ درہم یومیہ ۔[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: فضائل ، خدمات اور مناصب کا لحاظ کرتے ہوئے وظائف مقرر فرمائے جَو بارہ ہزار درہم [2]سالانہ تک تھے۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق تھا تو یہ ضابطہ مقرر کردیا کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہواس کا وظیفہ جاری کردیا جائے ۔ اس کے علاوہ یمن کا علاقہ

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۶۴۶ ص ۳۶۳۔

[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارہ ہزار درہم سالانہ باقی تمام ازواج کے دس دس ہزار ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام مہاجرین کے جو غزوہ بدر میں شریک تھے پانچ پانچ ہزار ، حضرات انصار جو بدر میں شریک تھے ان کے چار چار ہزار (کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۵۴۹ صفحہ ۲۲۴)

زرخیز تھا تو وہاں یہ حالت ہوگئی کہ ایسے ضرورت مند نہ رہے جن کوزکوٰۃ دی جاسکے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن کے والی (گورنر) تھے انہوں نے جو زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں وصول کیں ان کا ایک تہائی مرکز بیت المال (مدینہ) میں بھیجا مگر بجائے مبارکباد کے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جانب سے تنبیہ نامہ پہنچا :

”آپ کو یمن اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ وہاں سے چندہ یا جزیہ وصول کرکے یہاں بھیجیں۔ آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہاں کے اہل استطاعت سے زکوٰۃ وصدقات وصول کریں اور اسی علاقہ کے ضرورت مندوں پر تقسیم کردیں ۔ پھر آپ نے یہ رقم کیسے بھیجی“؟

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا :

سب کو دے دیا گیا جب یہاں کوئی لینے والا نہ رہا تو یہ فاضل رقم بھیج دی “۔

اگلے سال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے نصف اور تیسرے سال زکوٰۃ کی پوری رقم مرکزی بیت المال میں بھیج دی اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اتنی سختی سے لکھا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا دولفظی جواب یہ تھا ۔

ماوجدت احداً یا خذ منی شیئاً [1]

کوئی نہیں ملا جو مجھ سے کچھ لے لے ۔

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۱۹۱، صفحہ ۵۹۶ ۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوا تو مدینہ کی یہ حالت ہوگئی کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم لئے پھرتے تھے اور کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جو اسے قبول کرلے ۔

سنہ ۷ ھ میں خیبر فتح ہوا تھا ۔ اس وقت سے اسلامی مملکت اس قابل ہوئی تھی کہ کسی درجے پر مالی نظام قائم ہوسکا ۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت سنہ ۲۳ ھ سے شروع ہوا اس سولہ سال کے عرصے میں پوری مملکت کی یہ حالت ہوگئی کہ غریبی کا نام و نشان نہیں رہا ہے[4] ساتھ ساتھ تعمیرات کا سلسلہ

---

[4] اس نظام کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ شدید خانہ جنگی کے باوجود خوشحالی کا دور دورہ رہا ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت یعنی خلافت راشدہ کے تیس سال ختم ہونے کے بعد اگرچہ وصول اورخرچ کے بارے میں وہ احتیاط باقی نہیں رہی تھی مگر جو اقتصادی ساکھ قائم ہوچکی تھی وہ قائم رہی ۔ جس کی ایک مثال یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریباً ستاون سال بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز (المتوفی رجب سنہ ۱۰۷ ھ ، ۷۲۰ ء) نے نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا تو آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمن (گورنرعراق) کو حکم بھیجا کہ وظائف مقررہ ادا کردیں۔ گورنر صاحب نے تعمیل حکم کے بعد رپورٹ بھیجی کہ تمام وظائف ادا کئے جاچکے ہیں تب بھی کافی رقم باقی رہی ۔ دربار خلافت سے حکم صادر ہوا آپ کے صوبہ میں جتنے مقروض ہیں ان کا جائزہ لو اور ان سب کے قرض ادا کردو جو فضول خرچی کی بنیاد پر مقروض نہ ہوئے ہوں ۔ گورنر صاحب نے تعمیل کے بعد رپورٹ بھیجی کہ سب مقروض کے قرض ادا کئے جاچکے ہیں تب بھی رقم باقی رہی تو حکم صادر ہوا جن نوجوانوں کے نکاح نہیں ہوئے ان کے نکاح کرادیجئے اور مہر اس رقم

شروع ہوا تو وہی مدینہ جس میں قبہ دار پھاٹک ناپسند فرمایاگیا تھا اب اس کی تعمیرات محدود علاقہ سے آگے بڑھ کر کوہ سلع تک پہنچ گئیں ۔ جو احد کے قریب مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے ۔

تیسرا کام :قریش و اہل یثرب کا معاہدہ

یہود سے مصالحت

(۱)

یثرب ومضافات یثرب (مدینہ) اس عرب کا ایک علاقہ تھا جہاں نہ کوئی حکومت و سلطنت تھی نہ فوج اور پولیس۔ پورا عرب آزاد و خود سرقبائل کا ایک وسیع جنگل تھا ۔وہاں صرف معاہدات کا ایک نظام تھا ۔ وہی قبائل کو جوڑتا تھا اور وہی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا ۔ دو قبیلوں میں اگر جنگ ہوگئی تو وہ ان قبیلوں تک ہی نہیں رہتی تھی بلکہ ان کے حلیف اور معاہدقبیلے میدان میں اترآتے تھے ۔ اس طرح دوقبیلوں کی لڑائی دونظاموں (دوقبائلی گروپوں) کی لڑائی بن جاتی تھی۔

سے ادا کردیجئے ۔ گورنر صاحب نے اس حکم کی تعمیل کے بعد بھی یہی رپورٹ بھیجی کہ رقم باقی ہے ۔حکم صادر ہوا جو غیرمسلم کاشتکار جزیہ ادا کرتے ہیں ان کا جائزہ لیجئے۔۔ ان کو تقاوی کی ضرورت ہوتو ان کی تقاوی دیدیجئے کہ وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ زمیں بوسکیں ۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۵۱ حدیث ۶۲۱)

یثرب کے دو قبیلے اوس وخزرج کے افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے بھی معاہدات تھے۔ یثرب کے قریب (بنو قریظہ، بنونضیروغیرہ) یہود کے جو قبائل آباد تھے ان معاہدات میں شریک تھے ۔ بن قریظہ ، قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔

ان معاہدات میں جس طرح دفاع کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ حملہ آور کا مقابلہ آپس کی متحدہ طاقت سے کریں گے اسی طرح یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر حلیف قبیلہ کا کوئی شخص کسی کوقتل کردے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی ۔

پنچائتی قسم کے کچھ قاعدے اصول متعارفہ کے طور پر رائج تھے جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے ۔ ان کے بموجب قتل کی بعض صورتوں میں "قصاص" ہوتا تھا۔ یعنی جان کے بدلے جان بعض صورتوں میں جان کے بدلے جان نہیں بلکہ دیت لازم ہوتی تھی ۔ دیت کے سو اونٹ مقرر تھے ۔ دیت اور بعض صورتوں میں "خون بہا" صرف قاتل یا قاتل کے اہل خانہ سے وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ قاتل کی سوسائٹی سے وصول کیاجاتا تھا۔ جس کو عاقلہ کہتے تھے۔ اس کی حدود ہوتی تھیں اس میں (سوسائٹی میں) قاتل کے قبیلہ کے آدمی بھی ہوتے تھے۔ حلیف قبیلوں کو بھی اس میں شریک ہونا پڑتا تھا اور معاہدات میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر دیت لازم ہو تو کس قبیلہ کو دیت میں کتنا حصہ لینا ہوگا ۔ ان شرائط کو جو قصاص ، خون بہا اور دیت کے

متعلق ہوا کرتی تھیں ان کو "معاقل" کہاجاتا تھا ۔

(۲)

قریشی حضرات جو ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے ایک نیا عنصر تھے ۔ اگرچہ حضرات انصار نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور اس طرح مکی اورمدنی مسلمانوں کا ایک گروپ بن سکتا تھا جو ایک نئی سیاسی اور مذہبی پارٹی کی حیثیت میں رونما ہوتا ؟ مگر رحمت عالمﷺ نے یہ صورت اختیار نہیں فرمائی ۔

یہ گروپ ایک وزن رکھتا تھا اور اگر صرف سیاسی انقلاب مقصود ہوتا تو یہ گروپ کار آمد ہوسکتا تھا لیکن جس کا نصب العین دعوت الی اللہ تھا وہ اس جتھ بندی کو پسند نہیں کرسکتا تھا ۔

حضرات انصار یعنی قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے جو افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے پورے قبیلے اور کتنے بطن مسلمان نہیں ہوئے تھے اور بہت سے وہ تھے کہ ان کے گھر کے بھی سب آدمی مسلمان نہیں ہوئے تھے ۔ وہ سابق مذہب پر قائم تھے ۔ اس طرح کی جتھہ بندی آپس میں تصادم اور مقابلہ کی شکل پیدا کردیتی جس کا نتیجہ فساد فی الارض اور قطع ارحام ہوتا جو اسلام میں بدترین جرم ہے ۔

جتھہ بندی اور علیحدگی کے برخلاف رحمت عالم ﷺ نے اتفاق و اتحاد اور میل ملاپ کا راستہ اختیار کیا ۔ آپ نے اس علاقہ کے تمام باشندوں

میں خیرسگالی اور تعاون و امداد باہمی کی روح پیدا کرنی چاہی ۔ مواخات جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے اس کی پہلی کڑی تھی۔ جس سے آپ نے مہاجرین اورانصار میں نہ صرف تعاون اور خیرسگالی کا رشتہ قائم کیا بلکہ انصار اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنادیا ۔

یثرب میں ایک فرقہ مشرکین کا تھا جو قریش مکہ کا ہم مذہب تھا اور قریش مکہ اس کو آسانی سے اپنا آلہ کار بناسکتے تھے ۔ دوسرا فرقہ یثرب کے قرب وجوار میں یہود کا تھا ۔ آنحضرت ﷺ نے حضرات مہاجرین کا رابطہ ان سے بھی قائم کردینا چاہا ۔

(۳)

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ نے جو کام سب سے پہلے کئے ان میں تیسرا کام یہ تھا کہ آپ نے مہاجرین اور ان تمام فرقوں میں بقاءباہم ، تعاون اور خیرخواہی اور خیراندیشی کا رشتہ قائم کرنے کے لئے ایک تحریر مرتب فرمائی اس کو عہد نامہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک وفاق کا دستورا ساسی بھی ۔ قریش مکہ کی تمام کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے جس کامیابی کے ساتھ آنحضرت ﷺ اور حضرات مہاجرین مکہ سے نکل کر مدینہ تشریف لائے تھے اوریہاں ایک مرکز کی بنیاد ڈال دی تھی اس نے جس طرح قریش کو چراغ پاکردیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے فوراً [1] ہی اس

---

[1] چنانچہ اپنے ہم مشرب یعنی مشرکین مدینہ کو خط لکھا کہ مسلمانوں کو نکال دو یا ان سے جنگ کرو ، ورنہ

مرکز کو ختم کرنے کی سازش شروع کردی تھی اس کا بھی تقاضا تھا کہ حضرات مہاجرین اور باشندگان یثرب و مضافات یثرب کے درمیان تعاون ، تحفظ اور بقاءباہم کا عہدوپیمان ہو۔ اس عہد نامے سے یہ تقاضا بھی پورا ہورہا تھا ۔

(۴)

اس عہد نامے کا ایک فریق حضرات قریش میں جو ایمان واسلام سے مشرف ہوئے اور ہجرت کرکے مدینے میں قیام پذیر ہوئے جن کو عہد نامے میں المومنین والمسلمین من قریش سے تعبیر کیاگیا ہے ، دو سرافریق اہل یثرب ہیں (کسی مذہبی فرقے کی بناءپر نہیں بلکہ باشندے یثرب کی حیثیت سے) ان میں حضرات انصار کے علاوہ وہ بھی شامل ہیں جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اپنے کفروشرک پر قائم تھے، ان میں عبداللہ بن ابی بن سلول جیسے رؤ سا بھی تھے جوکھلم کھلا❷ آنحضرتﷺ اور اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہود بنونضیر، بنو قریظہ ، بنو قینقاع وغیرہ اہل یثرب نہیں ہیں، یہ قبائل یثرب سے باہر

ہم مدینے پہنچیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کردیں گے ، عورتوں کی آبرو خراب کرینگے (ابوداؤد شریف باب خیرالنضیر)تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں جلد اول (قریش کی طرف سے یثرب میں مخالف محاذ)

❷ ملاحظہ ہو بخاری شریف ص ۶۵۶ و ص ۹۱۶ و ص ۹۲۴ وغیرہ حدیث اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جس میں تذکرہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مجمع کو خطاب فرمانا چاہا تو عبداللہ بن ابی بن سلول نے توہین آمیز انداز سے مخالفت کی ۔

مضافات یثرب میں آباد تھے ۔ اہل یثرب (اوس اور خزرج) سے ان کے معاہدات تھے۔ ان معاہدات کو آنحضرت ﷺ نے نظرانداز نہیں فرمایا بلکہ ان کو مستحکم اور مضبوط کیا ہے ۔ چنانچہ انہیں معاہدات کے واسطہ سے ان کو اس عہد نامہ میں شامل فرمایا ہے :

آنحضرت ﷺ کوئی فریق[3] نہیں ہیں آپ ایک سرپرست ہیں اور اس معاہدہ کے بانی کی حیثیت سے آپ کو مرکزی شخصیت تسلیم کیاگیا ہے اور یہ طے کیاگیا ہے کہ باہمی نزاعات میں آپ کی ذات پاک مرجع ہوگی اور آپ کافیصلہ آخری ہوگا ۔

آپ کی یہ مرکزی حیثیت کسی مادی طاقت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ انصار و مہاجرین کی مٹھی بھر جماعت جو آپ کے ساتھ تھی یہ طاقت نہیں رکھتی تھی کہ مشرکین یثرب اور قبائل یہود کو اس پرمجبور کردے کہ وہ آپ کومرکز اور مرجع تسلیم کریں ۔ یہ آپ کی پرتقدس شخصیت کا اعجاز تھا کہ مخالفین کے قلوب بھی اس اعتراف پر مجبور ہوگئے کہ آپ سے صرف سچائی ، انصاف اور ہمدردی وخیرخواہی کی توقع کی جاسکتی ہے ۔ آپ جیسا شخص کا ذب و ظالم نہیں ہوسکتا ۔ آپ کی اسی مقبولیت نے جو چند روز میں حاصل ہوگئی تھی آپ کو مرجع اور مرکز بنایا اور آپ کی اسی مقبولیت نے ان کا

---

[3] جو تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آیا وہ تو سب کا تھا وہ کسی ایک کا کیسے ہوسکتا تھا۔

بھی وزن بڑھادیا جو آپ کے جـان نثـار تھے ۔ پھـر اس معاہدے کے ایک ایک لفظ پـر نظرڈالـئے کـوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا انکـار کیـا جاسـکے ۔ سچائی ، تقویٰ اور نیک کـردار کی تاکیـد بـار بـار کی گـــئی ہے جس ســے انکــار کــوئی بھی نہیں کرسکتا تھا ۔

سرپرستانہ حیثیت کے علاوہ (جـونزاع کے وقت مرجع بـنے گی) اور کـوئی اختیـار آپ نے اپـنے لـئے منظور نہیں کرایا ۔

دنیـا کی تـاریخ نے اس عہد نـامے کـو یہ اہمیت دی ہے کہ اس کـــو "اقـــدم دســـتور مســـجل فی العـالم" (دنیـا میں بنیـادی حقـوق کی سـب سـے پہلی باقاعـــدہ دســـتاویز) بھی کہاگیــا ۔ لہذا ہم اس کو بجنسہ نقل کـرتے ہیں ۔ اردوداں حضـرات کی آسانی کے لئے ہرایک فقرے کے سـامنے اس کـا ترجمہ کردیاگیا ہے ۔ فقروں کے شروع میں نمـــبر عہد نامے میں نہیں ہیں ۔ یہ مترجم کا اضـافہ ہے تاکہ منشاءاور مفہوم پوری طرح واضح ہوجائے ۔ اس عہد نامے کی حیثیت ابن ہشـام نے ان الفـاظ میں بیان کی ہے ۔

قـال ابن اسـحاق وکتب رسـول اللّٰہ ﷺ کتابـاً بین المهاجرین والانصار و وادع فیہ یهود وعاهـدهم و اقـــرهم علیٰ دینهم وامـــوالهم علیهم وشـــرط واشترط لهم

(ترجمہ : فن مغازی کے امام علامہ ابن اسحاق نے بیان فرمایا :رسول اللہ ﷺ نے ایـک کتـاب (تحریـر) لکھی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان اس تحریـــر

میں یہود سے بھی مصالحت کی صورت اختیار کی۔ ان سے معاہدہ کیا اور ان کو اپنے دین پر قائم رکھا اور جو جائیدادیں ان کی تھیں ان پر قائم رکھا ۔کچھ شرطیں ان پر لگائیں اور کچھ شرطیں ان کے لئے تسلیم کیں ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(١) ھٰذا کتاب من محمدالنبی رسول اللہ بین المومنین والمسلمین من قریش واھل یثرب ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم

"یہ تحریر ہے محمد اللہ کے نبی کی طرف سے جو اللہ کے رسول ہیں قریش کے مومنین ومسلمین اور اہل یثرب کے درمیان اور جو ان کے[١] تابع ہیں اور ان سے الحاق کئے ہوئے ہیں ۔ اور کوشش وجدوجہد میں ان کے ساتھ ہیں۔

(٢) انّھم امۃً واحدۃ دون الناس

"یہ کہ یہ سب (اپنے ماسوا) تمام انسانوں کے

---

[١] نحوی قاعدے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جو اہل یثرب کے تابع اور ان کے ساتھ ہیں۔ اسی عہدنامہ کے دوسرے حصے میں یہود کا تذکرہ ہے اس میں یہود بنی النجار ، یہود بنی الحارث وغیرہ کے الفاظ میں جن سے اسی کی تائید ہوتی ہے یعنی بنی النجار کے ساتھ جو یہود ہیں انہیں یہود بنی النجار کہاگیا ہے باقی دوسری صورت کہ یہ معنیٰ لئے جائیں کہ جو یہود مسلمانوں کے تابع ہیں وہ نحوی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہیں اور عہدنامہ کے سیاق اور پرداخت کے بھی مخالف ہے ۔ علاوہ ازیں جو یہود مسلمانوں کے ساتھ ہوں ان کو ایک علیحدہ فقرہ (١١) میں بیان کیاگیا ہے ۔

مقابلہ میں ایک امت❷ ہونگے“

(۳) المهاجرون من قریش علی ربعتہم❸

”قریش کے وہ افراد جو ہجرت کرکے آئے ہیں وہ اپنے حال پر بدستور رہیں گے ۔ ان کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے ۔“

یتعاقلون بینہم وهم تغدون عانیهم بالمعروف والقسط بین المسلمین

”قصاص وخون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے ان کا کوئی شخص قید ہوگا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کرینگے (کوئی حلیف اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا) یہ تمام باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ طے کیاجائے گا ۔“

(۴) وبنوعوف علی ربعتہم یتعاقلون معاقلهم الاولیٰ کل طائفة تفدی عانیها بالمعروف والقسط بین المومنین ۔

بنو عوف کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص ، خون بہا اور دیت کے متعلق جوان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ ان کا کوئی شخص قید ہوگا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام

---

❷ گروہ ، قوم ، جماعت یعنی اگر مذہبی آزادی حاصل رہے تو مسلمان دوسری قوم یا گروہ کے ساتھ مل کر امہ واحدہ ہوسکتے ہیں ۔

❸ ربعتهم کعبةٍ ای حالة حسنة وامرهم الذی کانوا علیہ (قاموس)

باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے۔

پھر اسی طرح قبائل بنو الحارث ، بنو ساعدہ ، بنو جشم، بنو النجار ، بنو عمروبن عوف ، بنو بنیت ، بنو الاوس کے نام لئے گئے ہیں اور ہر ایک قبیلے کے نام کے ساتھ یہ صراحت کردی گئی ہے جو مہاجرین اور بنو عوف کے لئے کی گئی ہے کہ ان کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے ۔ قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے ۔ ان کا کوئی شخص قید ہوجائے گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اسی طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔

(۵) ان المومنین لا یترکون مفر جاً[1] ان یعطوہ بالمعروف فی فداءاوعقل

یہ کہ مسلمان کسی ایسے شخص کو جو قرض میں دبا ہو اکثرا للعیال ہو اس بات سے نہیں چھوڑیں گے (محروم نہیں کرینگے)کہ اس کو اچھی طرح عطیہ دیں۔ فدیہ یا دیت کے سلسلہ میں[2]

---

[1] المفرج المثقل من الدین الکثیر والعیال (ابن ہشام ص ۳۰۲ ج ۱)

[2] یعنی اگر کوئی مقروض اور کثیرالعیال مسلما ن ہو اور اس پر کسی سلسلہ میں فدیہ یا دیت لازم ہوجائے تو مسلمانوں کو حق ہوگا کہ وہ اچھی طرح اس کی امداد

(۶) وأن لَایحالف مومن مولیٰ مومن دونہ

اور یہ کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ کسی مسلمان کو نظرانداز کرکے اس کے حلیف سے معاہدہ کرلے (جو مسلمان پہلے سے حلیف ہے اس کو بھی اس معاہدہ اور عہدوپیمان میں شریک رکھنا ہوگا)

(۷) وان المومنین المتقین ایدیهم علی کل من بغی منهم اوابتغی[❸] دسیعة ظلمہ اواثم اوعدوان اوفسادٍ بین المومنین وان ایدیهم علیہ جمیعاً ولوکان ولداحدهم

اور یہ کہ اہل تقویٰ مومنین سب کی طاقت متحد رہے گی، اس شخص کے مقابلہ میں جو ان سے بغاوت کرے (ان پر ظلم وزیادتی کرے) یا ظالمانہ طریقہ پر ان سے وصول کرنا چاہے ، یا مسلمانوں کے آپس میں گناہ ، ظلم یا فساد پھیلانا چاہے ایسے شخص کے مقابلہ میں ان کی طاقت متحد رہے گی خواہ (وہ ظالم) کسی کا اپنا لڑکا ہی ہو ۔

(۸) ولایقتل مومن مومنا فی کافر ولایُنصرکافر علی مومن

”یہ کہ کوئی مومن کسی مومن کو کسی

کریں اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو عام مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس امداد کا حق ہوگا اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ہوگا ۔ (واللہ اعلم)

❸ ای ابتغیٰ منهم ان یدفعوالیہ علی وجہ ظلمهم ای کونهم مظلومین (مجمع البحار)

کافر کی حمایت❹ میں قتل نہیں کرے گا۔ نہ کسی کافر کی کسی مومن کے مقابلے میں مدد کی جائے گی ۔“

(۹) وان ذمة اللہ واحدة یجیر علیهم ادنا هم

یہ کہ اللہ کی ذمہ داری (پناہ) ایک ہے (یعنی اللہ کے نام پر جو ذمہ داری لی جائیگی اس کا احترام تمام مسلمانوں پر لازم ہوگا) پناہ دے سکتاہے مسلمانوں کی ذمہ داری پر سب سے معمولی درجہ کا مسلمان بھی ۔❺

(۱۰) وان المومنین بعضهم مولیٰ بعض دون

---

❹ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مکہ کے مشہور رئیس ، دشمن اسلام امیہ بن خلف سے کاروباری سلسلہ میں معاہدہ کئے ہوئے تھے۔ غزوہ بدر میں حضرات انصار نے امیہ بن خلف کا تعاقب کیا ۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کو بچانا چاہا اس میں خود ان کو بھی تلوار لگ گئی اور زخمی ہوگئے مگر مجاہدین انصار نے امیہ کو قتل کرہی دیا۔ (بخاری شریف ص ۳۰۸)اب اگر امیہ کے حامی ان انصار سے قتل امیہ کا بدلہ لینا چاہتے (جیسا کہ قاعدہ تھا، بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا) اور اس سلسلہ میں معاہدہ کی بناپر یا کسی اورتعلق کی بنا پر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے مدد چاہتے تو معاہدہ کی اس دفعہ کے بموجب حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ حامیانِ امیہ بن خلف کی امداد کرتے۔ اس دفعہ کے معنیٰ یہ بھی لئے گئے ہیں کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو کسی کافرکے مقابلہ میں قتل کرنے کا مجاز نہ ہوگا ۔ مگر اس مفہوم کے لئے لفظ “بکافر” ہونا چاہئے تھا یہاں “فی کافر” ہے فی کافر کی صورت میں معنے وہی ہوسکتے ہیں جو ترجمہ میں لکھے گئے ۔ علاوہ ازیں میدان جنگ یا دارالحرب میں تو بیشک یہی ہے مگر دارالاسلام میں یہ حکم نہیں ہے وہاں اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کردے تو امام اعظم ؒ کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا ۔ واللہ اعلم بالصواب

الناس

اور یہ کہ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا ولی ہوگا (معاہدہ صلح وجنگ میں شریک ہوگا) یہ ولایت غیر مسلم کو حاصل نہیں ہوگی۔

(۱۱) وانہ من تبعنا من یهود فان لہ النصرالاسوة غیر مظلومین ولامتناصر علیهم

اور یہ کہ جو یہودی ہمارے ساتھ ہوں گے ان کی مدد کی جائے گی ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے گی وہ مظلوم نہیں ہونگے نہ ان کے ساتھ انتقامی[2] کارروائی کی جائے گی ۔

(۱۲) وان سلم المومنین واحدة لایسالم مومن دون مومن فی قتال فی سبیل اللہ الاعلی سواءوعدل بینهم

اور یہ کہ مسلمانوں کی صلح ایک ہے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو بغیر قتال فی سبیل اللہ (راہ خدامیں جنگ) کے سلسلہ میں صلح نہیں کرسکتا مگر اس صورت میں کہ مساوات ہو اور آپس میں پوری طرح انصاف ہو (جب کسی معمولی مسلمان کے عہدوپیمان کو بھی یہ اہمیت ہے کہ وہ سب مسلمانوں کا عہدوپیمان مانا جاتا ہے تو مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ صلح یا عہد و پیمان ایسی صورت سے کرے جس

---

[1] یعنی اگر معمولی درجہ کا مسلمان جو ذمہ دارانہ حیثیت نہیں رکھتا ، نہ افسر ہے نہ عہدیدار ، عام مسلمان میں سے ایک ہے وہ بھی کسی غیرمسلم کو پناہ دیدے یا اس سے کوئی معاہدہ کرلے تو تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہوگی۔

[2] یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کے برخلاف ان کے مخالفین کی مدد نہیں کی جائے گی ۔

میں حقوق کی مساوات اور سراسر عدل و انصاف ہو ۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو صرف اپنے حق میں نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے حق میں کوتاہی ہے[3]) واللہ اعلم

(۱۳) وان کان غازیة غزت معنا یعقب بعضها بعضا[1]

”اور یہ کہ مجاہدین (غازیوں) کی جو جماعت ہمارے ساتھ (ہمارے نظام کے ماتحت) غزوے کریگی اس کا غزوہ نمبروار ہوگا۔ ایک ہی جماعت (فوج) مسلسل نہیں جائے گی بلکہ اگر ایک مرتبہ جاچکی ہے تو اب دوسری جماعت جائے گی۔ اس کے بعد اپنے نمبر پر یہ جاسکے گی ۔“

(۱۴) وان المومنین یبیءُ بعضهم بعضاً بمانال دماءهم فی سبیل اللہ

”اور یہ کہ مسلمان ایک دوسرے کے برابر ہوگا۔ اس (امتحان کی بنا پر جو پیش آیا ہوگا انن کے خونوں کو اللہ کی راہ میں ۔ یعنی جانی قربانی معیار ہے۔ فرق مراتب اسی معیار پر ہوگا جنکی قربانیاں مساوی ہیں ان کا درجہ بھی مساوی ہوگا ۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ قبائل میں

---

[3] اس کے باوجود افسر اعلیٰ کو مسترد کرنے کاحق نہیں ہے۔ وہ مسترد اسی وقت کرسکتا ہے جب ایسا عہدوپیمان ہو جس میں سراسر معصیت ہے، کسی حرام کو جائز یا حلال کو حرام قرار دے دیا گیا ہو ۔ تفصیلات کتب فقہ میں ہیں۔

[1] ای یکون الغزوة بینهم نوباً فاذاخرجت طائفة ثم عادت لم تکلف ان تعید ثانیة حتی یعقبها اخری غیرها (مجمع البحار تحت کلمة عقب)

جو فرق مراتب[2] پہلے تھا اب وہ قابل تسلیم نہیں ہوگا ۔ جب تک قربانیاں بھی اس درجہ کی نہ ہوں ۔ "

(۱۵) وان المومنین المتقین علی احسن ھدی واقومہ

اور یہ مومن متقی بہت بہتر طور و طریق اور نہایت مضبوط اصول پر قائم رہیں گے (اہل ایمان اور اہل تقویٰ کا فرض ہوگا کہ ان کے اطوار بہتر اور ان کے اصول واخلاق مضبوط ہوں)

(۱۶) وانہ لایجیرمشرک مالا بقریش ولانفسا ولا یحول دونہ علیٰ مومن

اور یہ کہ کوئی مشرک قریش کے کسی مال کی ذمہ داری نہیں لے گانہ کسی قریش کی جان کی ضمانت کرے گا(پناہ دیگا) نہ کسی قریش کی حمایت میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا ۔

(۱۷) وانہ من اعتسبط مومناً قتلاً عن بینة فانہ قودبھا الاان یرضی ولا المقتول بالعقل وان المومنین علیہ کافة ولایحل لھم الاقیام علیہ

جو شخص کسی بے قصور مسلما ن کو قتل

---

[2] چنانچہ پہلے قبائل بنی تمیم ، بنی اسد، بنی عامر افضل مانے جاتے تھے اور ان کے مقابلے میں قبائل جھینہ ، مزینہ ، مسلم اور غفار کا درجہ کم تھا ،مگر چونکہ یہ قبائل پہلے ہی اسلام سے مشرف ہوئے اور حضرات انصار ومہاجرین کے ساتھ خدمات انجام دیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کی فضیلت بیان فرمائی ارشاد ہوا: قریش والانصار وجھینہ ومزینہ واسلم وغفار واشجع میرے مددگار ہیں اور اللہ اور رسول ان کے مدد گار ہیں ۔ اللہ اور رسول کے علاوہ ان قبائل کا اور کوئی مددگار نہیں ہے۔(بخاری شریف باب ذکر اسلم وغفار مزینہ وجہنہ واشجع ص ۴۹۸)

کردیگا جس کا بینہ (باقاعدہ) شہادت موجود ہو
تو اس کے قصاص میں ماخوذ ہوگا۔ (جان کے بدلے
جان دینا ہوگی) البتہ اگر مقتول کے وارث خون
بہا پر راضی ہوجائیں تو خون بہادینا ہوگا اور
تمام مسلمانوں کو جماعتی حیثیت میں اس
اصول کو نافذ کرنا ہوگا جب تک اس پرعمل نہ
ہوجائے کسی اور کام میں مشغول ہوجا نا
مسلمانوں کے لئے درست نہ ہوگا ۔

(۱۸) انہ لایحل لمومن اقر بمافی ھٰذہ الصحیفة
واٰمن باللہ والیوم الاخر ان ینصر محدثا❷
اویوویہ وانہ من نصرہ اواٰواہ علیہ لعنة اللہ
وغضبہ یوم القیٰمة لایوخذمنہ صرف ولاعدل

اور یہ کہ جائز نہیں ہوگا کسی صاحب ایمان
کے لئے جو اس دستاویز کے مضمون کا اقرار کرے
اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے یہ کہ
کسی فتنہ پر داز کی مدد کرے یا کسی فتنہ اٹھانے
والے کو پناہ دے (اپنے یہاں ٹھیرائے)۔ اور جو اس
کی مدد کرے گا اور اس کو پناہ دیگا (ٹھیرنے کا
موقع دیگا)ا س پر اللہ کی لعنت خدا کا غضب ،
قیامت کے روز نہ اس کی تو بہ قبول ہو نہ فدیہ

---

❷ محدثا ۔ دال پر زیر جنایت کرنے والا (مجمع البحار) یہ
کوئی فتنہ اٹھانے والا، سازش کرنے والا بھی ہوسکتا ہے۔
اور بدعتی یعنی کسی بدعت کا ایجاد کرنے والا بھی
ہوسکتا ہے۔ اور اگر دال پر زبر ہو تو مراد فتنہ یا بدعت
ہوگی اور یہ مطلب ہوگا کہ کسی صاحب ایمان کے لئے
جائز نہیں ہوگا کہ کسی فتنہ کو پسند کرے اور اس کو
بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دے ۔ وایوء الرضا عنہ وصبرہ
علیہ واقرار فاعلہ (مجمع البحار)

(کفارہ)[2]

(۱۹) وانکم مهماختلفتم فیہ من شیءٍ فان مردہ الی اللہ والی محمد

اور یہ کہ جب بھی اس عہد نامہ کی کسی بات میں اختلاف کرو تو مرجع اللہ ہوگا اور محمدﷺ اس کا فیصلہ ذات اقدس محمدﷺ کے حوالہ ہوگا جو اس عہد نامہ کے بانی اور معاہدہ کرنے والوں کے سرپرست ہیں۔ اور آپ سے ہی فیصلہ کی اپیل ہوگی ۔

(۲۰) وان الیهود ینفقون مع المومنین ماداموا محاربین

جب تک کسی جنگ کا سلسلہ رہے تو مصارف جنگ مسلمانوں کے ساتھ یہود کو بھی برداشت کرنے ہوں گے ۔

(۲۱) وان یهود بنی عوف امة مع المومنین للیهود دینهم وللمسلمین دینهم، موالیهم و انفسهم الامن ظلم او اثم فانہ لا یوقع الانفسہ و اهل بیتہ

اور یہ کہ بنی عوف کے یہودی اور مسلمان ایک امت ہونگے۔ یہود کے لئے ان کا دین ہوگا اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔ اپنے اپنے مذہبوں میں آزاد رہتے ہوئے تیسرے کے مقابلہ میں ایک متحدہ طاقت ہونگے ۔ اور جو ان کے موالی ہیں آزاد کردہ غلام یا ان کے حلیف اور وہ خود ان سب کے لئے یہی ہے (کہ وہ اپنے دین پر) مگروہ شخص جو ظلم کرے، کیونکہ ایسا شخص خود

[2] یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ نہ اس کی نفل عبادت قبول ہو نہ فرض ۔ (مجمع البحار)

اپنے آپ کو اور اپنے اہل بیت (متعلقین) ہی کو برباد کرے گا ۔(اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی)۔

(۲۲) وان لیهود بنی النجار مثل مالیهود بنی عوف

یہود بنی نجار کے لئے بھی وہی شرطیں اور وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے بیان کئے گئے۔

(۲۳) اس کے بعد یہود بنی الحارث ، یہود بنی ساعدہ ، یہود بنی جشم ، یہود بنی الاوس ، یہود بنی ثعلبہ کا نام لیا گیا ہے اور ہر ایک کے متعلق یہ الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ مثل مالیہود بنی عوف ، ان کو وہی حقوق حاصل ہونگے جو یہود بنی عوف کے حقوق ہیں ۔

آخر میں یہ ہے :

الامن ظلم اواثم فانہ لایوقع الانفسہ واهل بیتہ

مگروہ شخص جو ظلم کرے یا کوئی جرم کرے کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے بیت (متعلقین) کوبرباد کردیگا اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی ۔

(۲۴) پھر یہ چند تشریحی اور توضیحی دفعات ہیں :

(الف) وان جفنة بطن من ثعلبة

(الف) یہ کہ جفنہ، ثعلبہ کا بطن (ضمنی قبیلہ)ہے۔

(ب) وان لبنی الشطینة مثل مالیهود بنی عوف و ان البردون الاثم

(ب) یہ کہ بنی شطنہ کے وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے (تسلیم کئے گئے) اور یہ کہ بر (نیکی اور بھلائی) نصب العین اور اصول کار ہوگا گناہ اور جرم نہیں ۔

(ج) وان موالی ثعلبہ کانفسھم

(ج) قبیلہ ثعلبہ کے موالی (حلیف آزاد کردہ غلام) کی حیثیت، خود بنی ثعلبہ جیسی ہوگی۔

(د) وان بطانة یهودکا نفسهم[1]

(د) یہود کے اہل وعیال ان کے خواص اور ماتحت خاندانوں اور افراد کی حیثیت خود یہود جیسی ہوگی (ان کے وہی حقوق ہونگے جو یہود کے ہیں)۔

(ہ) وانہ لایخرج منهم احد الاباذن محمّد

(ہ) اور یہ کہ جو جس کے ماتحت یا جس کے ساتھ ہے وہ اس سے علیحدہ نہیں ہوگا مگر محمد ﷺ کی اجازت سے۔

(۲۵) وانہ لاینحجز علیٰ ثار جرح

اور یہ کہ نہیں بندش لگائے گا کوئی زخم کے قصاص (زخم کے بدلے میں زخم) پر[2]۔

(۲۶) وانہ من فتک فبنفسہ واھل بیتہ الامن ظلم وان اللہ علی ابرھذا

” جو کسی کو بے خبری میں دھوکے سے ماردے اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے، اور اس کے اہل بیت پر، مگر وہ شخص جس نے ظلم کیا ہو اور ہم اللہ کو حاضر ناظرجان کر عہد کرتے ہیں

---

[1] بطانة الرجل اھلہ وخاصتہ وصاحبہ (قاموس)

[2] ۱۔ جب کہ توریت کا حکم تھا کہ زخم کے بدلے میں اسی جیسا زخم ، اس اصول کو ختم نہیں کیاجائے گا ۔

کے خوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ان شرائط پر عمل کریں گے ۔“

(۲۷) وان علی الیھود نفقتھم وعلی المسلمین نفقتھم

”اور یہ کہ یہود اپنے مصارف کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے مصارف کے۔ (جو اس عہدنامہ کی شرطوں کو پورا کرتے ہیں ، کرنے پڑیں گے ۔”

(۲۸) وان بینھم النصرعلی من حارب اھل ھذہ الصحیفة

” اور یہ کہ جو فریق اس معاہدہ میں شریک ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے ان کے مقابلہ میں جو ان معاہدہ کرنے والوں سے جنگ کرینگے ۔“

(۲۹) وان بینھم النصح والنصیحة والبردون الاثم وانہ لایاثم امرءبحلیفہ و ان النصر للمظلوم ۔

”اور یہ کہ اس معاہدہ کے تمام فریق آپس میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کرینگے، ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی ہدایت کرینگے، نیک کردار رہیں گے جرم اور گناہ نہیں کرینگے ۔ اور یہ کہ کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ مجرمانہ فعل نہیں کریگا ۔ اور یہ کہ مظلوم مستحقہ مدد ہوگا۔“

(۳۰) وان الیھود ینفقون مع المومنین ماداموالمحاربین

” اور یہ کہ جب تک کوئی جنگ ہوگی تو مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی خرچہ جنگ برداشت کرینگے ۔“

(۳۱) وان يــثرب حــرام جرفهــا لاهــل هــذه الصحيفة

”اور یہ کہ وہ پورا علاقہ جو حدود یــثرب میں ہے ان ســب کے لــئے واجب الاحــترام (محفــوظ علاقہ) ہوگا جو اس عہدنامہ میں شریک ہیں ۔“

(۳۲) وان الجار كالنفس غيرمضار ولا اثم

”اور یہ کہ پڑوسی کو خود اپنی جان کی برابر سمجھا جائے گا، نہ اس کو نقصان پہنچایا جائیگا نہ اس کے ساتھ کوئی مجرمانہ فعل کیا جائے گا ۔“

(۳۳) وانہ لاتجار حرمة الا باذن اهلها

”اور یہ کہ نہیں حفاظت اور پناہ میں لیاجائے گا کسی خاتون کو مگر اس کے اہل (ذمہ دار) کی اجازت سے“[۵]

(۳۴) وانہ ماكان بين اهل هذه الصحيفة من حدث اواشتجاريخاف فساده فان مرده الى اللّٰه والى محمد رسول اللّٰه ﷺ وان اللّٰه على اتقى مافى هذه الصحيفة وابره

” اور یہ کہ اس عہدنامہ کے فریقوں کے درمیان جو کوئی نئی بات پیش آئے یا کوئی نزاع ہوجس سے فساد کا خطرہ ہوتو اس میں اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیاجائے گا اور یہ کہ ہم سب اللہ کو حاضر وناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس عہد نامہ میں ہے اسکی پوری پابندی کرینگے اور اس کو نیکی اور بھلائی کے ساتھ پورا کرینگے ۔“

---

۵ مکہ کے مشرکین قریش اس معاہدہ میں داخل نہ تھے ۔ لہذا جب صلح حدیبیہ کے بعد ان کی عورتیں مسلمان ہوکر مدینہ منورہ پہنچیں تو ان کو پناہ میں لے لیا گیا ۔

(۳۵) وانہ لاتجارقریش ولا من نصرھا

”اور یہ کہ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی نہ اس کو جو قریش کی مدد کرے ۔“

(۳۶) وان بینھم النصر علی من دھم[2] یثرب

”اور یہ کہ اس عہدنامہ کے تمام شریک ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اس کے مقابلہ میں جو یثرب پرچڑھ آئے (حملہ کرے)“

(۳۷) وانہ اذادعواالی صلح یصالحونہ ویلبسونہ فانھم یصالحونہ ، ویلبسونہ، وانہم اذا دعواالی مثل ذلک فانہ لھم علی المومنین الامن محارب فی الدین

”اور یہ کہ اس عہدنامہ کے جملہ فریق جب (مسلمانوں کی طرف سے) ان کو کسی کے ساتھ صلح کرنے کی دعوت دی جائے گی وہ صلح کرینگے اور صلح پر عمل کرینگے اور یہ کہ جب مسلمانوں کو اسی جیسی صلح کی دعوت دی جائے تو وہ بھی صلح کرینگے۔ مسلمانوں پر یہ انکا حق ہوگا مگر یہ کہ کسی سے دین کے بارے میں جنگ ہورہی ہو (مذہبی جنگ ہو)

(۳۸) علی کل اناس حصتھم من جانبھم الذی قبلھم

اور یہ کہ ہر فریق پر اس حصے کی ذمہ داری ہے جو اس کی جانب میں ہے۔

وان یھودالاوس موالیھم وانفسھم علیٰ مثل مالاھل ھذہ الصیحفتہ مع البر المحض من اھل ھذہ الصحیفة وان البردون الاثم لایکسب کاسب

---

[2] دھمک غشیک (القاموس)

الاعلی نفسہ وان اللہ علی اصدق ما فی ھذہ الصحیفة وابرہ ۔

اور یہ کہ قبیلہ اوس کے یہود ان کے موالی (حلیف یا آزاد کردہ غلام) ان کو وہی حقوق ہونگے جو اس عہدنامہ کے تمام فریقوں کو ہونگے، پوری نیک کرداری اور مخلصانہ بھلائی کے ساتھ نیک کرداری ہی ہمارا اصل اصول ہوگا ۔ مجرمانہ فعل (سے کوئی تعلق نہیں ہوگا) ہر ایک عمل کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا (اس کے فعل کو کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جاسکے گا) اور اللہ تعالیٰ کو ہم حاضر وناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس دستاویز میں لکھا گیا ہے اس پر پوری سچائی سے اور نیک کرداری کے ساتھ عمل کرینگے ۔

(۴۰) وانہ لایحول ھذا الکتاب د ون ظالم وآثم وانہ من خرج آمن ومن قعد آمن بالمدینة الامن ظلم واثم وان اللہ جارلمن بر والتقیٰ ومحمد رسول اللہ ﷺ

اور یہ کہ یہ تحریر کسی ظالم اور مجرم کیلئے آڑ نہیں بنے گی جو مدینے سے باہر ہو وہ بھی امن میں اور جو اندر رہے وہ بھی امن میں رہے گا ۔ مگر یہ کہ وہ ظلم کرے یا مجرمانہ حرکت کرے اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ اس کے محافظ ہیں جونیک کردار رہ کر پوری پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرے ۔